ادب کے تانیثی مطالعات: اردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ

(Feminist Studies of Literature: An Analytical Study identity of Female Key Characters of Urdu Novel)

مقالہ برائے ایم فِل (اُردو)

مقالہ نگار

سعدیہ بتول ہرل

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فروری ۲۰۲۴ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مذکورہ مقالہ پڑھنے کے بعد مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان	:	**ادب کے تانیثی مطالعات: اردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ**
پیش کار	:	سعدیہ بتول ہرل
رجسٹریشن نمبر	:	NUML-F21-17569 ماسٹر آف فلاسفی شعبہ زبان و ادب اُردو
ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان نگران مقالہ	:	______________________
پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ڈین، فیکلٹی آف لینگویجز	:	______________________
میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی (ہلال امتیاز ملٹری) (ریکٹر)	:	______________________
تاریخ	:	______________________

اقرار نامہ

میں، سعدیہ بتول ہرل حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کی ماسٹر آف فلاسفی، سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان کی نگرانی میں کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آیندہ کروں گی۔

سعدیہ بتول ہرل

مقالہ نگار

فہرست عنوانات

عنوان			صفحہ نمبر
مقالہ اور دفاع کی منظوری کا فارم			i
اقرار نامہ			ii
فہرست ابواب			iii
Abstract			v
اظہار تشکر			vi
باب اول	:	موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
		الف۔ تمہید	۱
	i	موضوع کا تعارف	۱
	ii	بیانِ مسئلہ	۱
	iii	مقاصدِ تحقیق	۲
	iv	تحقیقی سوالات	۲
	v	نظری دائرۂ کار	۲
	vi	تحقیقی طریقہ کار	۴
	vii	مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۴
	viii	تحدید	۵
	ix	پس منظری مطالعہ	۵
	x	تحقیق کی اہمیت	۶

ب۔ بنیادی مباحث ۶

باب دوم : منتخب اردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں میں نسوانیت (feminine) / صنفی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ ۴۱

باب سوم : منتخب اردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں میں نسوانی تنقید / سماجی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ ۶۵

باب چہارم : منتخب اردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں میں خود شناسی / ذاتی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ ۸۳

ماحصل ۱۰۱

نتائج ۱۱۰

سفارشات ۱۱۲

کتابیات ۱۱۳

ضمیمہ جات ۱۱۸

ABSTRACT

The proposed topic consists on analytical study of the identity of the main female characters of two Urdu novels. Under this, the role of women in the novels of Jameela Hashmi and Humira Ashfaq, "Chehra Beh Chehra Ro Be Roo" and "Me Suzam" has examined, under the proposed research topic. It is intended to do an analytical study of the identity of the main female characters of the two novels. The main character of Jamila Hashmi's novel " Chehra Beh Chehra Ro Be Roo" is Qaraat-ul-Ain Tahira, who was a historical figure of Iran and an important member of the Baha'i movement, while the main character of the novel "Me Suzam" is Rabia Khuzdari, a well-known Persian poet. Male Dominated Society by Jamila Hashmi and Humira Ashfaq

I have made the subject of injustice and discrimination against women. In our society, male domination is found every where and men have a special importance, even women's names are attributed to their father first then to their husband after marriage the man’s has always made the woman subordinate, even if she has perform as a mother, sister, daughter or wife. In these two novels, it has been observed and analyzed from the perspective of women, to what extent the above-mentioned writer has dealt with this subject.

اظہارِ تشکر

تمام تعریفیں اُس ذات پاک کے لیے جس نے انسان کو پیدا کیا اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے اُن علوم وفنون تک رسائی دی جسے زندگی کے مختلف شعبوں میں استعمال کرتے ہوئے انسان نے زندگی میں جینے کا ہنر سیکھا۔ بے شک ہم اُس کی نعمتوں کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ اُسی ذات نے مجھے یہ فکر دی اور اس قابل بنایا کہ میں اپنا تحقیقی مقالہ "ادب کے تانیثی مطالعات: اُردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ" (ایم فل اُردو) کی ڈگری کے حصول کے لیے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز میں پیش کرسکوں۔

میری کچھ تدریسی اور نجی ذمہ داریوں کے باعث اس قدر مصروفیات رہیں کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ شاید میں اس مقالے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں لیکن خدا کارساز ہے جس نے مجھے یہ ہمت اور حوصلہ عطا کیا اور میرا کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔

میں اپنے والدین کی شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے نہ صرف میری خواہشات کو پورا کیا بلکہ میری تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے اپنی ضروریات زندگی سے منہ پھیر لیا اور اپنی ذات پر اس اہم فرض کو ترجیح دی۔ میں اپنے شوہر، اساتذہ کرام، صدرِ شعبہ اُردو اور اپنے ہم جماعت دوستوں اور خصوصی طور پر اپنی نگران محترمہ پروفیسر ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان کی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری رہنمائی کی جس کی وجہ سے یہ مشکل مرحلہ سر ہوا۔

سعدیہ بتول ہرل

اسکالر ایم فل (اُردو)

باب: اوّل

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف (INTRODUCTION)

مذکورہ موضوع اردو کے دو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس کے تحت اردو کے دو ناول نگاروں جمیلہ ہاشمی اور حمیرا اشفاق کے ناول "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" اور "می سوزم" میں عورت کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مجوزہ تحقیقی موضوع کے تحت مذکورہ دو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ کرنا کیا گیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ناول "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" کا مرکزی کردار قرۃ العین طاہرہ ہے جو ایران کی تاریخی شخصیت اور بہائی تحریک کی اہم رکن تھیں جبکہ ناول "می سوزم" کا مرکزی کردار رابعہ خضداری ہے جو فارسی کی معروف شاعرہ ہیں۔ جمیلہ ہاشمی اور حمیرا اشفاق نے مرد معاشرہ (Male Dominated Society) میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور امتیازات کو موضوع بنایا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ہر جگہ مرد کا تسلط پایا جاتا ہے اور مرد کو ہی امتیازی اہمیت حاصل ہے حتیٰ کہ خواتین کے نام بھی پہلے باپ اور پھر شادی کے بعد شوہر سے منسوب ہوتے ہیں اور مرد نے ہمیشہ عورت کو ماتحت بنا کر رکھا ہے بھلے وہ ماں، بہن، بیٹی یا بیوی کے روپ میں ہے عورت کی اپنی ذاتی شناخت قائم نہیں ہوتی وہ ہمیشہ مرد کی محتاج رہی ہے اور اسی چیز نے اسے مکمل شخصیت نہیں بننے دیا۔ ان دو ناول میں تانیثی حوالے سے مطالعہ اور تجزیہ کیا گیا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ مذکورہ مصنفہ نے اس موضوع کے ساتھ کس حد تک نباہ کیا ہے۔

۲۔ بیان مسئلہ: (THESIS STATEMENT)

مجوزہ تحقیق اردو کے ناول "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" اور "می سوزم" کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ مجوزہ تحقیقی موضوع کے تحت ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو کے ان دو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ کر کے یہ دیکھا گیا ہے کہ عورت کے کردار،

اس کی سوچ اور فکر کو کس ڈھنگ سے نمایاں کیا گیا ہے نیز یہ کردار نگاری کس سطح کی ہے ؟ اس مطالعے میں اس نوعیت کے احوال کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

۳۔ تحقیق کے مقاصد

۱. منتخب اردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں قرۃ العین طاہرہ اور رابعہ خضداری کی تانیثی تھیوری میں صنفی شناخت کے حوالے سامنے لایا گیا ہے۔
۲. منتخب اردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں قرۃ العین طاہرہ اور رابعہ خضداری کی تانیثی تھیوری میں سماجی حیثیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔
۳. منتخب اردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں قرۃ العین طاہرہ اور رابعہ خضداری کی تانیثی تھیوری میں ذاتی شناخت کا تعین کیا گیا ہے۔

۴۔ تحقیقی سوالات

۱. منتخب اردو ناولوں کے مرکزی نسوانی کرداروں قرۃ العین طاہرہ اور رابعہ خضداری کی صنفی شناخت کیا ہے ؟
۲. منتخب ناولوں کے مرکزی نسوانی کرداروں کی سماجی حیثیت و نوعیت کیا ہے ؟
۳. دونوں ناولوں کے مرکزی نسوانی کرداروں کی ذاتی شناخت کیسے متعین ہوتی ہے ؟

۵۔ نظری دائرہ کار (THEORETICAL FRAME WORK)

فیمینزم یا تانیثیت اس احساس کا نام ہے کہ معاشرے میں عورت مظلوم ہے اور مختلف طریقوں سے ظلم و جبر کا شکار ہے۔ مجوزہ موضوع مقالہ کے تحت ایلن شوالٹر کی پیش کردہ تانیثی تھیوری کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ تانیثیت عربی زبان کا لفظ ہے۔ تانیثیت کو انگریزی میں Feminism کہا جاتا ہے۔ یہ لاطینی زبان کا لفظ

ہے۔ جس کو اصطلاح میں Femina کا مترادف کہا جاتا ہے۔ تانیثیت کو تحریکِ نسواں، نظریۂ نسواں، حقوقِ نسواں اور نسوانیت کہا جاتا ہے۔ تانیثیت سے مراد عورتوں کے جذبات، احساسات، مشاہدات، رجحانات اور مسائل کی ترجمانی ہے۔ تانیثیت کی تحریک مردوں کی بالادستی اور ان کے ظلم و جبر استحصال اور عورتوں کی حق تلفیوں کے خلاف ردعمل کے طور پر مغربی ممالک میں ابھر کر سامنے آئی اور رفتہ رفتہ مشرقی ممالک میں پھیلتی چلی گئی۔ اس تحریک کا آغاز ۱۹۸۱ء میں فرنچ میڈیکل ٹیکسٹ میں لفظ فیمنسٹ نسوانیت والے مردوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ البتہ مغرب میں یہ تحریک آزادی نسواں کے حامیوں کو بھی کہا گیا ہے۔ بعد میں لفظ فیمنزم تحریک نسواں اس کی اصطلاح بن گئی۔ ایلین شوالٹر نے تانیثیت کو نظریے کی صورت فراہم کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اس کی کوشش سے تانیثی تھیوری کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے یعنی ایلین شوالٹر نے انتقاد نسواں (Gynocriticism) کی بنیاد رکھی۔ شوالٹر نے نسوانی تنقید کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا ہے:

۱. نسوانیت یا صنفی شناخت (feminine): اس مرحلے کے ذریعے عورت کو معاشرے کے تناظر میں سمجھا جاتا ہے۔

۲. نسوانی تنقید (The feminist criticism): اس مرحلے کے ذریعے عورت کو مرد کے تناظر میں سمجھا جاتا ہے۔

۳. خودشناسی (The female): شوالٹر کے تیسرے مرحلے کے ذریعے عورت ہونے کا احساس یا عورت کو عورت کے ذریعے یا عورت کی خوددریافتی / خودشناسی کو سمجھا جاتا ہے۔

درج بالا موضوعات سے ایلین شوالٹر کی تانیثی تھیوری مجوزہ موضوع میں عورت کی سماجی، صنفی اور ذاتی شناخت کا تنقیدی مطالعہ (ایلین شوالٹر کی تانیثی تھیوری کے تناظر میں) کرنے کے لیے نظری دائرہ کار کے طور پر مدنظر رہی۔ اس تھیوری کا پہلا مرحلہ نسوانیت (Feminine) کے تناظر میں عورت کی سماجی شناخت کی وضاحت کی گئی ہے۔ شوالٹر کی تھیوری کے دوسرے مرحلے نسوانی تنقید (The Feminist Criticism) عورت کی مرد کے تناظر میں شناخت کو واضح کیا جائے گا جو کہ صنفی اعتبار سے ہے۔ شوالٹر کے تیسرے مرحلے "عورت ہونا" (The Female) یعنی خودشناسی کے تناظر میں ناول میں "می سوزم" اور "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو" کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کو خود عورت کے نقطۂ نظر سے واضح کیا گیا ہے۔

مجوزہ موضوع کو ایلین شوالٹر کی تھیوری کے تناظر میں پر کھا جائے گیا ہے۔ ایلین شوالٹر کی یہ تھیوری جو تین مراحل میں تقسیم کی گئی ہے۔ شوالٹر کی کتاب "Literature of Their own" جو کہ ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی، اس کتاب میں پہلی مرتبہ بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد اس پر "The Feminist Criticism" کے نام پر باقاعدہ تحریک شروع ہوئی اور اس تحریک کو شوالٹر نے مختلف مضامین کے ذریعے پیش کیا ہے اور یہ مضامین شوالٹر کی کتاب "Towards Feminist Poetics" میں موجود ہیں۔

مجوزہ موضوع میں جمیلہ ہاشمی کے ناول "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو" اور حمیرا اشفاق کے ناول "می سوزم" کو ایلین شوالٹر کی تانیثی تھیوری کے تناظر سے پر کھا گیا ہے۔ اس موضوع میں دیگر فنی و فکری زاویے تحقیق کا حصّہ نہیں ہیں۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار (RESEARCH METHODOLGY)

تحقیق کا موضوع "اُردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ" ہے، جسے ایلین شوالٹر کی تانیثی تھیوری کے تحت پر کھا گیا ہے۔ لہٰذا تاریخی طریقہ تحقیق کے تحت موضوع کے متعلق مطبوعات کی جمع آوری، ترتیب، مطالعہ اور تجزیہ کیا گیا ہے۔ بنیادی ماخذات میں جمیلہ ہاشمی اور حمیرا اشفاق کے ناول، ان کے افکار و خیالات وغیرہ کے متعلق مضامین، کتب، رسائل و جرائد کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ جن تک رسائی کے لیے لائبریری کے علاوہ انٹرنیٹ اور دیگر معاون مآخذات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق (WORKS ALREADY DONE)

مجوزہ موضوع اور ناولوں پر ایسی کوئی تحقیق تاحال نہیں ہوئی لیکن انٹرنیٹ پر تبصرے کے طور پر کچھ مواد موجود ہے جو جزوی طور پر ناول کے موضوعات اور تاریخی حوالے اور اہمیت پر لکھے گئے مضامین ہیں۔ جن میں ناول "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو" پر تحقیقی مضامین ملتے ہیں جن میں ڈاکٹر فردوس احمد بٹ کا مضمون "جمیلہ ہاشمی کے ناول" خصوصیت کے ساتھ شامل ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سعدیہ طاہر کا تحقیقی

و تنقیدی مضمون "چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو: جمیلہ ہاشمی کی ایران شناسی" اور مسعود منور کا مضمون "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو: فنی جائزہ" شامل ہیں۔

موضوعِ تحقیق میں شامل دوسرا ناول بھی اہم ہے جس پر تحقیقی و تنقیدی مضامین ہی ملتے ہیں جن میں حنا جمشید کا مضمون "ظلم، عشق اور جرأت کی داستان: می سوزم" اور آکاش علی مغل کا مضمون "می سوزم ناول، تجزیہ" اہم ہیں۔

۸۔ تحدید (DELIMITATIONS)

مجوزہ موضوع اُردو کے دو ناول "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" اور "می سوزم" کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے اور یہ تحقیق صرف انہی ناولوں کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کے تجزیاتی مطالعے تک محدود ہے۔ جن کو ایلین شوالٹر کی تانیثی تھیوری کے تحت پر کھا گیا ہے۔

۹۔ پس منظری مطالعہ (LITERATURE REVIEW)

اردو ناول "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو" اور "می سوزم" پر اب تک مختلف رسائل و جرائد میں مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان ناولوں پر مختلف پہلوؤں سے مقالات بھی لکھے جا چکے ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد سے جاری ہونے والے رسالے "ادبیات" کا ناول نمبر (دو جلدیں) ان میں بھی مختصر اًبات کی گئی ہے۔ اس مقالے میں ناول کے عہد کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور مرکزی نسوانی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان ناولوں کا تقابل بھی سامنے آئے گا جو اس موضوع کی اہمیت کو مزید بڑھا دے گا۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت(SIGNIFICANCE OF STUDY)

جمیلہ ہاشمی اور حمیرا اشفاق نے اپنے ناول میں ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کی ہے جہاں پر مردوں کی اجارہ داری ہے۔ عورت پستی کا شکار ہے۔ انہوں نے اس سماج میں پھیلی جہالت، توہمات پرستی اور غلط رسم و رواج کی بھینٹ چڑھی عورت کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں معاشرتی وسماجی برائیوں کی نشاندہی کی ہے۔

درج بالا تحقیق سے اُردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کے تجزیاتی مطالعے سے ایک نئی، اہم اور قابل توجہ جہت نمایاں ہوئی ہے۔

بنیادی مباحث

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے۔ انسان اپنی عقل وطاقت کی بنا کر دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ عورت اور مرد کو ہر میدان میں شانہ بشانہ جدوجہد کرنے کا حق حاصل ہے کیونکہ دونوں کو عقل وفہم عطا کی گئی ہے لیکن دیکھا جائے تو عورت نے اپنے آپ کو منوانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے اور تمام اُمور میں مرد کی مددگار نظر آتی ہے مگر پھر بھی اپنا مقام حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ ایک جرمن خاتون لکھتی ہیں:

> "میری تاریخ کی کتابیں جھوٹ بولتی ہیں وہ کہتی ہیں میرا افعال موجود نہیں تھا عورت کا وجود تو یقیناً تھا لیکن یہ وہ تصویر ہے جو مردوں نے پیش کی ہے تاریخ کے اوراق پر جو عورت اُبھرتی ہے اس کا کردار وعمل کے تابع ہے"۔(۱)

عورت کے تاریخی تصور کو دیکھا جائے تو مخالف جنس کے برعکس نظر آتا ہے۔ عورت اپنے آپ کو منوانے کے لیے جہدِ مسلسل سے گزرتی ہے۔ قدیم دور میں بھی عورت مرد کے لیے ہر طرح سے مددگار نظر آتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اولاد کو بھی جنم دیتی ہے اور اپنے اُمور خانہ سے بھی کسی قسم کی بھی

غفلت برتتی نظر نہیں آتی تھی۔ بعض تہذیبوں میں اسی بناپر عورت کی پرستش بھی کی جانے لگی۔اس حوالے سے گولڈن چائلڈ رقم طراز ہیں:

"تہذیب کی ابتدا عورتوں نے کی۔ وہ اناج اُگاتی تھیں، اسے پیستی تھیں روٹی پکاتی تھیں، دھاگہ بنانے کے فن سے بھی اُنہیں واقفیت تھی جس سے وہ لباس تیار کرتی تھیں، جس سے گھریلو خوبصورتی پیدا ہو۔ جب کہ مرد زراعت کے لیے زمین تیار کرتا اور شکار کھیلتا تھا، ہتھیار بناتا تھا، مرد اور عورت حیاتیاتی طور پر مختلف ضرور ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ عورت کمتر ہے اور مرد برتر ہے"۔(۲)

سیمون دی بوائے عورت کے بارے میں لکھتی ہیں:

"سب اس حقیقت کی تفہیم پر متفق ہیں کہ نوع انسانی میں مادائیں موجود ہیں۔ ہمیشہ کی طرح آج کی انسانیت کا نصف حصّہ ان پر مشتمل ہے پھر بھی ہمیں کہا جاتا ہے کہ نسوانیت خطرے میں ہے۔ہمیں عورتیں ہونے، عورتیں ہی رہنے اور عورتیں بننے کی نصیحتیں کی جاتی ہیں۔تب یہ لگتا ہے کہ ہر مونث انسان لازماً عورت نہیں۔ عورت ہونے کے لیے اسے نسوانیت نامی ایک پر اسرار اور ڈراونی حقیقت میں شریک ہونا ضروری ہے"۔(۳)

ڈاکٹر حمیرا اشفاق کی پہچان استاد، محقق، دانشور، نقاد، افسانہ نگار اور اب "می سوزم" کی اشاعت کے بعد ناول نگار کے طور پر ہوتی ہے۔ ان کے پہلے ناول "می سوزم" کو ۲۰۲۱ء میں سنگ میل پبلی کیشن، لاہور نے شائع کیا۔ یہ ناول ایک تاریخی ناول ہے جس میں ایک ہزار سالہ پرانی شاعرہ رابعہ خضداری یا رابعہ بلخی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ مشہور مصنفہ فہمیدہ ریاض نے رابعہ خضداری کے شعری تراجم کیے گئے ہیں جو "بلوچستان کا ادب اور خواتین" کے نام سے وعدہ کتاب گھر، کراچی نے شائع کیے ہیں۔

یہ ناول دراصل ایسی شاعرہ کے بارے میں ہے جو رودکی کے دور کی شاعرہ ہے۔رودکی کو فارسی شاعری کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے اِس شاعرہ کو زین العرب کے نام سے بھی جانا جاتا

ہے۔ اس کے معنی عربوں کے حسن کے ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں ہے لیکن تذکرہ نگاروں نے اس کی تاریخ پیدائش ۹۴۰ء لکھی ہے اور یہ افغانستان کے مشہور شہر بلخ میں پیدا ہوئیں اور یہی دور شبلی نعمانی نے اپنی کتاب "شعر العجم" میں لکھا ہے۔ اس نے اپنے آخری شعر اپنے خون سے محل کی دیوار پر لکھے تھے کیونکہ اس کے بھائی نے غیرت کے نام پر اس کے ہاتھوں کو کاٹا تھا کہ عورتیں شعر و شاعری نہیں کرتیں، نہ ہی حکومت کے معاملات میں مداخلت کرتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں حمیرا اشفاق نے اپنے ناول میں بیان کی ہیں۔ یعنی ایک ہزار سال پہلے مرنے والی شاعرہ کو ناول لکھ کر دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ مزار شریف میں بڑی بڑی عظیم ہستیاں مدفون ہیں جن میں رابعہ خضداری بھی شامل ہیں۔ رابعہ خضداری کا ایک بہت بڑا مجسمہ شہر کے وسط میں نصب ہے۔ رابعہ محبت کی ایک ایسی داستان ہے جو انسانیت سے محبت کرتی ہے لیکن اس کے بھائی کو یہ بات بالکل گوارا نہیں تھی جس کی پاداش میں محل کے اندر ہی اس کا قتل کر دیا گیا۔ اس کے مزار پر جو لوح ہے اس پر لکھا ہے "آرامگاہ رابعہ خضداری" رابعہ خضداری دختر کعب از فرماروا ں بلخ۔

"می سوزم" ناول میں اس نسائی کردار کو حمیرا اشفاق نے بڑے پرکشش اور اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ تاریخ کی مشہور شاعرہ اور نامور خواتین جن میں رابعہ خضداری کا نام شامل ہے جس نے شاہ ایران کا بستر بننے سے انکار کر دیا تھا۔ شاہ نے اس کی موت کا پروانہ جاری کر دیا لیکن کوئی بھی اس کو مارنے میں آگے نہیں جا رہا تھا کیونکہ وہ خوبصورت عورت ہونے کے علاوہ ایک خوبصورت شاعرہ بھی تھیں لیکن اس کو ایک بدصورت موت بھی دی گئی تھی۔ شاعر مرد ہو یا عورت وہ مرتا نہیں ہے بلکہ زندہ رہتا ہے۔ مارنے والا ہمیشہ تاریخ میں بُرے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آج بھی محبت کرنے والے رابعہ خضداری کے مزار پر محبت کی کامیابی کی منت مانتے ہیں اور اس کا بھائی حارث جس نے رابعہ خضداری اور اپنے باپ کو زہر دلوا کر مروا دیا تھا آج تک بُرے ناموں سے ہی تاریخ اِسے یاد کرتی ہے۔ رابعہ خضداری کے باپ امیر کعب نے اپنی بیٹی کی تربیت میں ہر قسم کے فن اور اعلی تعلیم کا بندوبست کیا تھا جب بیٹی کی شاعری کی دھوم چار سو پھیل گئی تو کعب اپنی بیٹی کی ذہانت سے خوش ہوتا تھا۔ جبکہ اس کا بھائی جو کہ اقتدار کا رسیا اور عوام پر بے جا ٹیکس لگاتا تھا، وہی ان دونوں کا دشمن بنا۔ رابعہ خضداری کے استاد مولوی فیض الحسن جو کہ ایک باریش صوفی تھے ان کا یہ کہنا ہے کہ میں امیر صاحب کے بچوں کا استاد رہا ہوں لیکن جو صلاحیتیں میں نے رابعہ میں دیکھی ہیں وہ دوسروں میں نہیں دیکھیں۔ اس دور میں جس کا ذکر ڈاکٹر حمیرا اشفاق اپنے ناول میں کیا ہے کہ جب بھی اپنی مجلس میں شعر و شاعری کا تذکرہ ہوتا تو بڑے بڑے شاعر ان کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ بیٹی کی اس قدر تعریفیں سن کر امیر کعب

پھولے نہ سماتا تھا۔ناول کی ہیئت سوانحی طرز کی ہے جس کا ذکر صفِ اوّل پر حمیرا اشفاق نے درج بھی کیا ہے۔ لیکن اس کی تکنیک میں کہیں خط کی تکنیک ہے تو کہیں فلش بیگ یا پیشگوئی کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ کرداروں میں معصوم بے گناہ لوگ جو جنگ کا ایندھن بنتے تھے۔ غدار سپہ سالار جو بادشاہ کو زہر تک دے دیتے ہیں ان کا انجام بھی ناول میں دکھایا گیا ہے۔ناول میں رابعہ خضداری کا کردار مرکزی نسوانی کردار ہے جو کہ وقت کی نامور شاعرہ ہیں جس کا اظہار ناول میں اس طرح کیا گیا ہے کہ ناول کا ایک کردار فیض الحسن جو کہ رابعہ کا اُستاد بھی ہے۔وہ یوں کہتا ہے:

> "میں نے ان کی فارسی اور عربی شعر وادب کی جس طرح دسترس دیکھی ہے باخدا وہ عہد حاضر کے بلند پایا شاعر اقبال رودکی کے برابر نظر آتی ہیں۔ رابعہ خضداری دخترِ کعب ایران کی عہد عثانیہ کی درخشاں ترین شاعرہ بنے گی"۔(۴)

ناول میں ایک نسوانی کردار گلِ رعنا کا ہے جو کہ محل کی کنیز ہے لیکن رابعہ کی ہم راز بھی ہے۔اس نے رابعہ کو بتایا کہ آج کل جنگ کا دور دورہ ہے غزنوی حکمران فتوحات پر فتوحات کر رہے ہیں اور ہمارے ساسانی حکمران اپنی تلواروں کو زنگ آلود رکھ رہے ہیں۔ ہم نے اگر بروقت تیاری نہ کی تو موت ہمارا مقدر ہو گی۔ اس کا جواب سن کر رابعہ نے کہا کہ اگر سب دوست بن جائیں اور کوئی دشمن نہ رہے تو کیسا رہے گا۔ شہزادی رابعہ کی بات سن کر کنیز گل رعنا ایک دم سکتے میں آگئی۔ شہزادی نے چھت پر کھیلتے کبوتروں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ دیکھو کتنے امن سے پرندے کھیل رہے ہیں۔ کیا ہم انسان ان سے بھی محبت کرنا سیکھ لیں ساتھ ہی رابعہ شہزادی نے کبوتروں کا کھانا لانے کے لیے گل رعنا کو کہا اور یہ بھی بتایا کہ کٹورے بھی پانی سے بھر دے تاکہ مخلوق خدا سیر ہو کر اپنا پیٹ بھر سکے۔ گل رعنا کا کردار ایک معاون کردار کا ہے جو اصلی کرداروں کا لازمی جز ہے۔ گل رعنا کی زبانی شہزادی رابعہ ان کو مشورے بھی دے رہی ہے جیسا کہ امیر کعب کھانے کے بعد اپنے بیٹے حارث سے یہ بھی کہتا ہے کہ کچھ قبائلی بغاوت پر اتر آئے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ فوج کو مشکوں کا حکم دیا جائے کہ فوج کاہل نہ ہو جائے اور مشکوں کے بعد تازہ دم ہو جائے تاکہ دشمن کا مقابلہ کر سکے۔ اس کے بعد امیر کعب نے اپنے بیٹے حارث سے کہا کہ آج رات محفل شعر وشاعری ہے آپ بھی تشریف لائیں۔ لیکن وہ یہ کہتا

کہ شہزادی پردے کے اندر سے بھی شریکِ محفل ہو سکتی ہے، سامنے آنا ضروری ہے کیا؟ یعنی نفرت سے امیر کعب کا جواب ملاحظہ ہو:

"نہیں یہ میری لائق بیٹی ہے علم و زکاوت کے ساتھ احساس انسانیت کے زیور سے آراستہ یہ بلخ کی شان ہے یہ میرے پہلو میں تشریف رکھیں گی دربانوں کو بلا کر انتظام کر دیا جائے حارث چپ ہو گیا"۔(۵)

امیر کعب کے ہاں سپہ سالار عبد الستار کے ذریعے ایک نیا باورچی رکھا گیا جس کو ایک نرم سفوف دیا گیا جو کہ زہر تھا۔ زہر کھانے سے امیر کعب کے پھیپھڑے ختم ہو گئے۔ وہ دنیا فانی سے کوچ کر گیا جس کے بعد اس کے بیٹے حارث نے امیر کعب کی مُہر کو چُرا کر لوگوں سے دُگنا ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا تھا جس کا امیر کعب کو بڑا رنج تھا۔ وہ رعایا کو اتنا تنگ نہیں کرتا تھا جس طرح ان پر بے جا مالی بوجھ ڈال دیا گیا تھا۔ عبد الستار سپہ سالار نے امیر کعب کو کہا وہ ملاحظہ ہو:

"حضور اس سرکاری فرمان پر مُہر تو بلا شبہ میری ہے لیکن اس کو میری اجازت کے بغیر استعمال کیا گیا"۔(٦)

وفادار سپہ سالار بہادر علی نے کہا کہ حضور آپ کی مُہر کو عبد الستار کی اجازت کے بغیر آپ کے بیٹے حارث نے چرا کر جعلی فرمان جاری کر دیا ہے اور لوگوں کو یہ کہا گیا کہ زیادہ پیسے ہوں گے تو سامان حرب زیادہ خرید سکیں گے۔ زہر کا اثر آہستہ آہستہ امیر کعب کی موت کا سبب بنا۔ امیر کعب کے آخری الفاظ تھے "رابعہ بنت کعب"۔

امام خاتون ایک الگ کردار ہے جو محل کے اندر تمام کنیزوں کی سردار اور بادشاہ کے کھانے کا بھی پہلے خود معائنہ کرتی ہے اور وہ زہر خوانی سے مر جاتی ہے۔ زہر دینے والے خانساماں کو محل سے دُور بھیج دیا جاتا ہے۔ حارث عبد الستار کو شکار کے بہانے ساتھ جنگل میں لے جا کر گلہ دبا کر قتل کر دیتا ہے اور لاش وہیں پھینک دی تا کہ اصل بات کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکے لیکن رابعہ اس کھوج میں پختہ تھی آخر وہ کون ہے جو ہمارے ساتھ ایسا کر رہا ہے جس کا اِسے بعد میں پتہ چلا کہ اس کا اپنا بھائی ہی اقتدار کے لالچ میں آکر اِن تمام جرائم کا سرغنہ ہے۔ ناول میں ایک کردار سارنگ کا ہے جو محل کا داروغہ ہے جو ہر بات پر نظر رکھتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار بنت کعب جو کہ ایک نسوانی کردار ہے۔ محل کی اندرونی اور بیرونی سازشوں پر اس کی گہری نظر ہے۔

یہی گہری نظر اس کے کردار کی دلیل ہے جو کہ ناول کی ہیروئن بھی ہے۔ پورے ناول پر یہی نسوانی کردار چھایا ہوا ہے۔

امام خاتون کا کردار

ناول میں امام خاتون جو کہ تمام کنیزوں کی سردار ہے جب امیر کعب کی زہر کھانے کی وجہ سے موت واقع ہوتی ہے۔ شہزادی رابعہ کو فکر لاحق ہوتی ہے کہ جب سے امیر کعب فوت ہوئے ہیں یہ عورت بھی دن بدن لاغر ہوتی جارہی ہے تو اس نے ایک دن بڑے شاہی حکیم کو بلا کر اس کا معائنہ کرنے کو کہا۔ تب شاہی حکیم نے اس کے جوڑوں پر لکڑی کی ہتھوڑی سے ضربیں لگا کر دیکھیں تو دو دن کے بعد اس کے اعضاء نیلے رنگ سے سیاہ رنگ میں تبدیل ہوگئے۔ حکیم نے شہزادی رابعہ کو کہا کہ اس نے بادشاہ کے کھانے کا زہر چکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس پر اثر کر گیا ہے۔ بالآخر وہ بھی اللہ کو پیاری ہو جاتی ہیں جس کا شہزادی کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔ محل کے اندر جب رابعہ خضداری اس کا حال پوچھنے بستر مرگ پر جاتی ہے تو امام خاتون اس وقت بھی اپنی تابعداری اسے دکھاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "پیاری رابعہ ایک چاہت اس سے بڑی ہوتی ہے بگولے کی طرح اس مزاج کی محبت کو اڑالے جاتی ہے پھر آخر کار خود میں جنم لیتی ہے۔ وہ گرداب ایک اور طرح کی چاہت ہے میری پیاری"۔(۷)

بستر مرگ پر وہ شہزادی رابعہ کو کہتی ہے کہ عشق ایک سمندر ہے مگر کیا دریاوں کے ملنے سے سمندر نہیں بنتے۔ یوں ہی مجاز کا عشق بھی تو ایک دریا ہے اور دریا مل کر سمندر بناتے ہیں۔ اب آخری باری رابعہ امام خاتون کو بوسہ دیتی ہے پھر اس کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ ناول میں امام خاتون کا کردار نیک سیرت عورت کا ہے جو کہ مرکزی کردار رابعہ کے ساتھ تھوڑی دیر چل کر اپنے اختتام کو پہنچتا ہے لیکن وجہ یہ ہے کہ ناول میں ذیلی کرداروں میں بھی مٹھاس ہے جو کہ حمیرا اشفاق کا ایک انوکھا کارنامہ ہے جو اس تحریر میں ناول کا روپ دھارتی ہے اور یہی نسوانی کردار وفا کی نشانی بھی ہے جو کہ ناول کی کہانی کو توانا بناتی ہے۔

سالم خان کا کردار

ناول میں ایک کردار سالم خان کا ہے جسے جبری بھرتی کر کے لاہور کے محاذ پر بھیجا جاتا ہے۔ وفا خان جو کہ عبدالستار کا بیٹا ہے اس کو بھی ایک فوجی دستے کا سربراہ بنا کر ٹریننگ کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ سالم خان کی ماں جو کہ ایک اندھی خاتون ہے ایک چھوٹا بھائی اور ایک چچازاد بہن ہے جو کہ ایک خاندان ہے۔ ماں بیٹے کی جدائی میں رو رو کر مر جاتی ہے اور اس کا بھائی اپنی تمام بھیڑ بکریاں گاؤں کے مولوی کو دے کر بھائی کی تلاش میں محل کی طرف نکلتا ہے تاکہ اسے ماں کی وفات کا حال سنا سکے۔ سالم خان بلوچ نوجوان ہے جو کہ حکمرانوں کی ضد کی وجہ سے گھر سے دور ہے اس کو صرف ایک بوری اناج دے کر فوج میں بھرتی کیا گیا تھا۔ رابعہ خاتون کو اس کا بڑا دکھ تھا آخر کار وہ اس کے بھائی اور رشتہ دار خاتون کو محل میں نوکر رکھ لیتی ہے۔ اس کے بھائی کا نام میوہ خان تھا اور شاہ بانو اس کی چچی تھی۔

وفا خان

ناول میں ایک ذیلی کردار وفا خان کا ہے جو کہ عبدالستار سپہ سالار کا بیٹا ہے۔ عبدالستار کو تو قتل کر کے جنگل میں پھینک دیا جاتا ہے اور بیٹے کو سپہ سالار بنا کر ٹریننگ کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ حارث نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ یہ اپنے باپ کی موت کو بھول جائے گا لیکن اس نے بغاوت کر کے حارث کو ناکوں چنے چبوائے۔ آخر میں وفا خان کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ میرے باپ کو استعمال کر کے حارث نے قتل کیا اور مجھے رابعہ خضداری سے بھی چاہت ہے کہ وہ حق پر ہے اور اس کا بھائی حارث جابر سلطان ہے جو کم سن لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ حارث نے جس باورچی کے ذریعے اپنے والد کو زہر دیا اس باورچی کی زبان کاٹ کر قید کر دیا تھا۔ آخر کار وفا خان کے حملے نے اس کی جان بخشی کرائی۔ اس کے ساتھ دوسرے کردار سارنگ، سالم خان اور اللہ بخش تھے۔ وفا خان اپنی جان دے کر باپ کا بدلہ لیتا ہے۔

بیکتاش کا کردار

ناول "می سوزم" میں بیکتاش کا کردار ایک اچھے سپاہی کا ہے جس کے باپ کو امیر کعب کا خاص غلام ہونے کا شرف حاصل تھا لیکن رابعہ اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ پہلے پہل تو وہ جھجکتی ہے پھر بیکتاش کو پیار بھرا خط کچھ اس انداز سے لکھتی ہے:

> "ملاحظہ ہو پوری سلطنت میں تم وہ واحد شخص ہو جس کا حق ہے کہ میں اس کے لیے شعر کہوں اور اپنے دیوان کو تیرے نام کی زینت دوں۔ مجھے اپنے والد کے حسین انتخاب پر فخر ہے جس نے تم جیسے زیرک بہادر اور پاسدار وفادار شخص کے ہاتھ میں فوج کی باگ ڈور دی۔ دوسری طرف یہ میرے لیے حیرت انگیز بھی ہے کہ آپ کی جگہ وفا خان کو سپہ سالار بنا دیا گیا ہے۔ لیکن میرا یقین کہتا ہے کہ اپنی رعیت کی ساکھ کی نیکی کی وجہ تمہاری ذمہ دار طبعیت ہے جس نے انہیں اعتماد دیا اور عوام کھلے دروازوں اور دکانوں سے گذر جاتے ہیں۔ میں خواہش رکھتی ہوں کہ آپ کے دل میں بلغ اور خضدار کی اس سلطنت کی محبت کے سوا کسی چیز کی جگہ نہ رہے۔
>
> آپ کے نامہ لطیف کی منتظر
>
> رابعہ ناشاد"(۸)

شہزادی آخر میں بیکتاش کے ساتھ مل کر باغیوں کی حمایت کرتی ہے۔ بیکتاش باغی قبائل کی قیادت کرتا ہے اور حارث کو محل کے اندر سے بھگا دیتا ہے۔

شاہ بانو اور رابعہ خضداری

خاتون شاہ بانو ناول میں ایک ادبی کردار ہے۔ ایک دن باغ بہشت میں شام کو محل کے اندر شاعری کی محفل کا انتظام کرتی ہے۔ رات کو چمن اپنی پوری تابانی پر تھا۔ خواتین نے اپنا تازہ کلام سنایا رابعہ جو کہ عروض

سے پوری طرح واقف تھی پہلے اس نے لڑکیوں کا کلام غور سے سُنا۔ پھر ان کو ٹوکا کہ یہ کیا ہوا غزل میں بحر کا خیال کیوں نہیں رکھ رہی ہیں۔ قندھار سے آئی ہوئی ایک شاعرہ کا بڑا شہرہ تھا۔ اسی محفل میں مشہور شاعر روش دل خضداری بھی موجود تھے۔ بعض عورتوں نے مرد شاعر کی موجودگی کو بُرا مانا۔ لیکن رابعہ نے کہا کہ شاعر لوگ بے ضرر ہوتے ہیں۔ روش دل خضداری نے رابطہ کار کا شکر ادا کیا۔ رابطہ کار نے روش دل خضداری کو کہا کہ آپ کے کلام کی شہرت آپ کو یہاں لے آئی ہے۔ خضداری نے کہا کہ میں کلام تو ضرور پیش کروں گا لیکن ایک عرض ہے کہ محفل کا کچھ رنگ سخن مجھ سے متعارف کروالیا جائے تو موزوں کلام کا انتخاب کر سکتا ہوں۔ گل بانو نے سارنگی تھامے کچھ پیش کیا۔ بعد ازاں سب خواتین نے اپنا کلام پیش کیا۔ روشن دل نے شعر کی مناسبت سے ہر شعر کے ٹکڑے پیش کیے۔ گل بانو کی بانسری نے محفل میں شعر کو چار چاند لگا دیے آخر میں رابعہ نے کہا:

"کتنا زیادہ خون میرے دل میں جمع ہو گیا ہے
مگر دل سے گل لالہ رنگ لے گیا ہے
اس کی یاد میں آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا ہے
میرا پورا جسم سیلاب کی مانند بن گیا ہے
چونکہ میں نے تیرے چہرے کی ہریالی دیکھی ہے" (۹)

روشن خضداری اور رابعہ خضداری کے کلام کے دوران خوب است، خوب است کے نعرے لگے۔

رابعہ خضداری اور حارث کا آخری مکالمہ:

حارث کی سلطنت میں بغاوت ہو چکی ہے قبائلی جتھوں کی صورت میں بیکتاش اور سالم وفا خان کی قیادت میں لڑ رہے ہیں رات کو قندھار سے واپسی پر جہاں سلطنت کے امیروں نے رابعہ خضداری کے شعروں کی تعریف کی تھی بڑئے غصے میں حارث نے کہا:

حارث: سفر کا بیان بعد میں بیان کروں گا بس آپ کی ایسی شہرت سن کر آرہا ہوں کہ سر شرم سے جھک گیا کیا تم ایک غلام سپاہی کے لیے خط لکھتی ہو۔

رابعہ: نہیں میں اپنے لیے شعر لکھتی ہوں۔

حارث: کیاشریف عورتوں کا یہی شغل ہے کہ وہ عشقیہ شاعری کریں۔

رابعہ: شریف مردوں کے اشغال بھی ہمارے سامنے ہیں بھائی جان۔ ان میں سے سب سے معصوم گناہ ہے جو طاقت کے نشے میں کیے جاتے ہیں۔ اس بارہ سال کی لڑکی کی شکل تو آپ کو یاد نہ ہو گی جیسے شکار گاہ میں آپ کے سامنے پھینکا گیا تھا۔

حارث: رابعہ اس گستاخی کی سزا آپ کو ضرور ملے گی اور غلام بیکتاش کو بھی تہ خانے سے آپ نے فرار کرایا ہے تا کہ وہ ہمارے خلاف لڑ سکے۔ تم کیسی بہن ہو جو بھائی کے دشمن سے عشق کرتی ہو۔

رابعہ: نہیں بھائی مجھے تخت و تاج سے کوئی سروکار نہیں بیکتاش میرا اب مسئلہ نہیں رہا۔ سالم خان کی ماں کی بے بسی، وفا خان کا قتل خداداد کی لاش کی بے حرمتی۔ یہاں تک کہ تو نے اپنے باپ کو خود قتل کرایا ہے اور میں اس دشمن رعایا کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتی ہوں۔ تم ایک یزید ہو اور تیرے خلاف لڑنا ثواب ہے۔

حارث: تالی بجاتے ہوئے دو سپاہیوں کو حکم دیتا ہے کہ اس لڑکی کا سر قلم کر دو۔ گل رعنا کو کہا کہ شہزادی کو محل کے خاص کمرے میں لے جایا جائے۔

حارث نے کمرہ بند کر کے رابعہ کے ہاتھوں کی نسیں کاٹ دیں رابعہ نے کٹے ہاتھوں سے اپنے خون سے دیوار پر شعر لکھے رابعہ کے آخری الفاظ تھے۔ بھائی توبہ کر و خدا کبھی بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں کرتا۔

ناول کا انجام بڑا بھیانک ہے۔ کیونکہ جرم کی ابتدا سے شروع ہونے والا ناول جرم پر ہی ختم ہوتا ہے۔ اس میں یزیدیت جیت جاتی ہے اور انصاف ورحم دلی ہار جاتی ہے۔(۱۰)

رابعہ خضداری کی صنفی شناخت:

بطور عورت رابعہ خضداری عاشق کے رول میں بھی نظر آتی ہیں جسے ایک غلام اور ان کی فوج کے سپہ سالار بیکتاش سے عشق ہو جاتا ہے۔ رابعہ خضداری کے لیے ذات پات وغیرہ اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ بیکتاش کی

محبت میں اپنے بھائی حارث کے سامنے بھی ڈٹ کر کھڑی نظر آتی ہے۔ بیکتاش کی جان خطرے میں ہوتی ہے تو شہزادی اپنے فن سپاہ گری سے سپاہیوں کو شکست دیتی ہے اور بیکتاش کی جان بچا کر وہاں سے لے جاتی ہے جس پر بیکتاش کو حیرت بھی ہوتی ہے کہ شہزادی اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچانے کے لیے آئی ہے۔ رابعہ خضداری دیگر علوم کے ساتھ ساتھ انسانیت کا درد بھی رکھتی تھی۔ رابعہ نے اپنی شاعری اور دانشمندی کی وجہ سے بہت شہرت پائی۔ دانشمندوں کی محفلوں میں بھی رابعہ کی تعریفیں کی جاتی تھیں۔ ریاست کے معاملات میں بھی رابعہ نہایت رازداری سے نظر رکھتی تھی اور مسائل کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی نظر آتی تھی جو کہ اس معاشرے کی عورت کے لیے قطعی درست نہیں سمجھا جاتا تھا۔

بطور بیٹی رابطہ خضداری نے باپ امیر کعب کی زندگی میں بھی والد کے احکامات کا خیال کیا اور مرنے کے بعد بھی بھائی جو کہ اقتدار کے نشے میں دھت تھا، اس کو والد کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایات دیتی رہی، مگر وہ باز نہ آیا۔ اس نے ہر طرف لوٹ مار مچا رکھی تھی جو کہ رابعہ خضداری سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ تب بھی رابعہ نے بیکتاش جو کہ جنگجو تھا اسے ریاست کے معاملات کی خبر رکھنے کا حکم دیا اور بیکتاش نے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے تمام راز رابعہ کے سامنے رکھ دیے دیکھا جائے تو رابعہ نے بطور بیٹی، بہن، عاشق اور بطور معاشرے کی فرد کے بلا خوف و خطر تمام فرائض بخوبی انجام دیے۔

حمیرا اشفاق کا یہ ناول اپنی تاریخی جہت کی وجہ سے ایک کامیاب ناول ہے جس میں نسائی کرداروں نے ناول کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ ناول کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔ تکنیک خطوط کی ہے کردار جاندار ہیں۔

جمیلہ ہاشمی کے ناول چہرہ بہ چہرہ روبرو کی صنفی شناخت:

جمیلہ ہاشمی اُردو کی مشہور ناول نگار ہیں۔ ناول "تلاش بہاراں" لکھنے پر انھیں "آدم جی ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ جمیلہ ہاشمی نے دو تاریخی ناول جن میں "دشت سوس" اور "چہرہ بہ چہرہ، روبرو" بھی لکھے جو کہ تاریخی ناول ہیں۔ "چہرہ بہ چہرہ، روبرو" ۱۹۷۷ء میں چھپا اور اس ناول نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی کامیابی کا لوہا منوایا۔ یہ تاریخی ناول دراصل ایک بابی یا بہائی تحریک کے گرد گھومتا ہے جو ملک میں انقلاب لانے اور اشتراکی نظریات کی حامی

تھی۔ یعنی ہر فرد کو برابر کے مالی حقوق دیے جائیں۔ تمام جائیدادیں اور انکم کے ذرائع حکومت وقت کے ہاتھ میں ہونے چاہیں تا کہ ہر فرد کو روٹی، کپڑا اور مکان مل سکے۔ شہنشائیت کا خاتمہ ہو سکے تا کہ لوگ برابری کی سطح پر امن وسکون سے زندگی بسر کر سکیں۔ ناول میں ایران کی تاریخی شخصیت "ام سلمی" جو کہ بابی تاریخ کی ایک سرگرم رکن کے گرد گھومتا ہے۔ "ام سلمی" کو قرۃ العین کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ بہائی یا بابیا ایران کا ایک اہم فرقہ ہے جس کے بانی علی محمد باب تھے۔ وہ ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۵ سال کی عمر میں اس نے باب ہونے کا دعوی کیا کہ امام مہدی کا ظہور میرے علم کے مطابق ہمیں معلوم ہے۔ ابتداء میں لوگوں نے ان کی مالیاتی اصلاحات پر توجہ دی لیکن شاہ ایران پر حملے کے بعد اس جماعت کو پابند کیا گیا اور سخت قانون کا سامنا کرنا پڑا۔ علماء تبریز نے ۱۸۵۰ء میں اس کے خلاف قتل کا فتوی دیا۔اس کے پیروکار جن کو اس کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے ان کا سرکاری اہلکاروں نے کھل کر قتل کیا۔ ان کی سرگرم رکن اُمَ سلمی جو کہ ایک شیعۂ ذاکر صالح قاذوینی کے ہاں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا ملا تقی اور چھوٹے چچا علی رشتی سے حاصل کی ایک بلند پایہ شاعرہ اور ایک ترقی پسند ذہن کی مالک تھیں اور چہرے کا پردہ نہیں کرتی تھیں۔ مختلف علماء نے ان کے خلاف الزامات لگائے لیکن علی رشتی نے انہیں طاہرہ یعنی پاک کا لقب دیا۔ مرزا علی محمد نے اپنے بیٹے ملا محمد سے ان کا رشتہ ازدواج طے کیا جب سارے بابیوں پر بادشاہ کا ظلم ستم بڑھتا گیا ان کے چچا اور دوسرے رشتہ داروں کو قتل کیا گیا قرۃ العین کو بھی ۱۸۵۲ء میں بادشاہ کے داروغہ نے گلا گھونٹ کر قتل کیا اور اس کی لاش کو ویران کنویں میں پھینک دیا۔ جمیلہ ہاشمی کے ان کرداروں نے ایک عجیب قسم کا سحر پیدا کیا ہے کہ ایک آزاد طبیعت کی مالک اُم سلمٰی جو کہ کسی کے لیے بھی بے ضرر تھی، کس طرح درندے لوگوں کی بھینٹ چڑھتی ہے۔ لوگ اس کی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ وہ گھٹن زدہ معاشرے سے عورتوں کی آزادی کی عملدار تھیں جو کہ مذہب کی آڑ لے کر ملاؤں نے ان پر مسلط کی تھیں۔ ایک دور میں اس کے حسن کا چرچہ سن کر بادشاہ بھی شادی کا پیغام بھیجتا ہے۔ لیکن اُسے رد کر دیتی ہے بادشاہ کو بھی اس بات کا غصہ تھا۔ ناول میں جمیلہ ہاشمی نے اُم سلمٰی کی کئی صلاحیتوں کے پردے سے نقاب اُٹھائے تو تصوف میں منصور حلاج محی الدین ابن عربی کی پیروکار ہے اور نجف اشرف میں حضرت علیؓ کے مزار پر تمام چیزوں کو دیکھتی ہے۔ ناول کا آغاز شہدائے کربلا سے ہوتا ہے جس میں یزید کا حضرت بی بی زینب سے مکالمہ بھی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جمیلہ ہاشمی کے ناول پر لکھا ہے کہ:

"ایک ایسی عظیم ہستی کو موضوع بنایا ہے جس کا نام آج تک خود ایک افسانہ ہے۔ اُمِ سلمیٰ جس کو ہم قرۃ العین طاہرہ کے نام سے جانتے ہیں۔ ایک ایسی بے قرار روح تھی جس کا دل بھی بڑا تھا اور دماغ بھی بڑا تھا، جو حق کی تلاش میں ساری عمر سرگرداں رہی اور حق کی تلاش میں ہی جان دے دی"۔(۱۱)

ڈاکٹر براؤن جس نے ۱۹۲۴ء میں "ہسٹری آف پرشیا" اور "تاریخ ادبیات ایران" پہلی بار لکھی گئی۔ اس میں بھی قرۃ العین طاہرہ کی بے حد تعریف کی گئی ہے کہ کس طرح ایک نسائی کردار جس نے ظلم کے اندھیروں میں روشنی کی ایک شمع روشن کی۔ آخر شمع کی روشنی ہی بجھ گئی جمیلہ ہاشمی کے ناول کا انتخاب جس میں مرکزی نسائی کرداروں کی وجہ سے آج بھی بابی تحریک زندہ ہے۔

نسائی تحریک جو کہ یورپ میں ۱۷۹۰ء میں شروع ہوئی اس کا باقاعدہ آغاز ۱۸۶۶ء میں انگلستان سے ہوا جس کا نام women suffer age تھا۔ اسی تحریک کی بدولت ۱۹۱۸ء میں خواتین کو ووٹ کا حق ملا ۱۹۲۸ء میں ایک بل کے ذریعے ابتدائی عمر ۲۱ برس رکھی گئی لیکن ۱۹۶۹ء میں نسائی تحریک کی شدت کو دیکھتے ہوئے ۱۸ برس کر دی گئی۔ ہندوستان میں حالات تبدیل ہوئے تو ایک وقت آیا جب ۱۸۲۹ء میں انگریز نے بزور شمشیر ستی جیسی فضول رسم کو ختم کیا۔ اس رسم میں مرد کے فوت ہونے پر عورت کو بھی جلا دیا جاتا تھا۔ اسی طرح انڈیا ایکٹ ۱۹۲۹ء میں بچپن کی شادی پر پابندی ۱۹۳۹ء میں مسلم عورتوں کو خلع کا حق بھی دیا گیا۔ ہندوستانی عورتوں کے حقوق کے بارے میں سب سے پہلے ڈاکٹر رشید جہاں نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۲ء اپنی وفات تک افسانہ لکھے جن میں عورتوں کے حقوق پر بات کی گئی۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے ناول "تلاش بہاراں" میں بھی ایک نسائی کردار کنول کنواری کو پیش کیا جو مادر پدر آزاد ہے نہ تنگ نظر، نہ جنون کی حد تک جاتی ہے بلکہ ایک ترقی یافتہ عورت ہے۔ وہ مذہب کو بھی مانتی ہے اور فضول عقائد کو بھی رد کرتی ہے۔ اُمِ سلمیٰ کا کردار بھی تنگ نظر سماج کے خلاف بغاوت ہے نہ کہ انسانوں کے خلاف۔ وہ انسانیت سے محبت کرتی ہے۔ قرۃ العین نسائیت کا ایک استعارہ ہے جو علم اور بہادری کی ایک زبردست مثال ہے جس نے اپنا خون دے کر نسائی آزادی کا پروانہ حاصل کیا۔ ڈاکٹر فردوس احمد بٹ اپنے ایک تحقیقی مضمون میں ناول "چہرہ بہ چہرہ، روبرو" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک جمیلہ ہاشمی کے تاریخی ناولوں کا تعلق ہے تو ان کے یہاں
فکشن اور تاریخ کا حسین سنگم نظر آتا ہے"۔(۱۲)

یہ ناول دراصل ایران کی تاریخی شخصیت اور بابی تحریک کی ایک کارکن فاطمہ زریں تاج لقب قرۃ العین طاہرہ کی کٹھن زندگی پر مشتمل ہے۔ اس میں دراصل ایران کے متوسط طبقے کی طرز زندگی کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کا منشور بھی پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ بادشاہ کی عدالت میں قرۃ العین طاہرہ پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اپنے چچا اور سسر محمد تقی کو اپنے راستے کی دیوار بنتے دیکھا تو اس کو قتل کرا کے خود قزوین سے تہران چلی گئی تھی۔ اس کے کہنے پر ایک بابی نے ۱۸۵۲ء میں نہ صرف دین شاہ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا جس کے بعد غصے میں آکر بابیوں کے قتل عام کا حکم دیا۔ خود یہ ناول جمیلہ ہاشمی نے لکھا ہے۔ طاہرہ کے بارے میں کیونکہ وہ ناول کی ہیروئن ہے۔

"مگر وہ قرۃ العین تھی زمانے کی آنکھوں کی پتلی مرشد کی آنکھوں کی
ٹھنڈک"۔(۱۳)

پورے ناول میں کرداروں کی وساطت سے انسانوں، مذہبوں، جنسوں اور ملکوں کی منافرت کو سامنے آتا ہوا دیکھتے ہیں جبکہ قرۃ العین لوگوں کی خاطر، انسانوں کی بھلائی کی خاطر اور انسانوں کے مستقبل کی خاطر اپنی جان قربان کرتی نظر آتی ہے۔(۱۴)

جمیلہ ہاشمی نے خود اپنے اس ناول کے بارے میں لکھا ہے:

"بات یہ ہے کہ تاریخ نے مجھے ہمیشہ محصور کیا ہے اور میں نے تاریخ کا مطالعہ عہدِ حاضر کی تاریخ کے تناظر میں کیا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں قرۃ العین طاہرہ جیسی عورت آج پیدا نہیں ہوتی۔ یہ جو آزادی نسواں کی تحریک اپنے ماحول سے نبرد آزما ہونے کی کوششیں ہیں۔ قرۃ العین طاہرہ اسی کی پیش رو ہے۔ اس طرح وہ لوگ جو اپنے کسی خوف کے لیے کسی اعلی مقصد کے لیے دار پر چڑھ گئے۔ میں نے انہیں لوگوں کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ میں نے ہمیشہ تاریخ سے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔ جن کی افاقیت نے مجھے متاثر کیا ہے"۔(۱۵)

جمیلہ ہاشمی تاریخی ناول نگاروں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ وہ دلکش تشبیہات اور حسین جملوں میں اپنے ناولوں میں انوکھے پن کے بہترین نمونے تخلیق کیے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس نے کئی تکنیکوں کا استعمال کیا ہے وہیں ناول "چہرہ بہ چہرہ، روبرو" اور "دشت سوس" میں اظہار کا بیانیہ اختیار کر کے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ اردو ناول کے نسائی کردار شروع سے ہی بڑے اہم ہیں مثال کے طور پر مراۃ العروس، اکبری اور اصغری کا کردار بڑھانے میں۔ اس کے علاوہ اسی ناول میں ماما عظمت کا کردار منفی طرز کا ہے۔ ایک کُٹنی کا کردار ہے جو فراڈ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ امراؤ جان ادا میں امراؤ کا کردار مرکزی کردار ہے۔ مرزا رسوا نے اس ناول میں جہاں لکھنو کی تہذیب و معاشرت کے علاوہ خانم کا کردار، بسم اللہ کا کردار سبھی بڑے اہم نسائی کردار ہیں، جنھوں نے اردو ناول میں خشت اوّل کا کام کیا ہے۔ تاریخ کے اوراق سے انھی نسوانی گم شدہ کرداروں کو جمیلہ ہاشمی نے زندہ کیا ہے۔ دراصل اپنی پسند کے کردار ڈالتی ہیں "دشت سوس" میں منصور حلاج کا کردار، جس کے ارد گرد پورا ناول گھومتا ہے۔ "چہرہ بہ چہرہ، روبرو" تاریخ کا گمشدہ کردار ہے۔ جس میں نسائی کرداروں کے ذریعے ایک تحریک کو تقویت پہنچی ہے جو ملک میں جاگیرداری اور شہنشاہیت کا خاتمہ چاہتی تھی لیکن مقدر کو یہ منظور نہیں تھا۔ ان نسائی کرداروں کے ذریعے جس نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر اس تحریک کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ جیسا کہ ناول کے شروع میں فیض احمد فیض کا شعر لکھا ہے:

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی تو کوئی بات نہیں ہے

قرۃ العین طاہرہ کا کردار اس ناول میں مرکزی کردار ہے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قرۃ العین طاہرہ وقت کے مشہور سکالر کاظم رشتی سے خط و خطابت کرتی ہے اور ظاہر و باطن کے فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ طاہرہ کو اپنے عورت ہونے پر بھی غصہ آتا ہے کہ آخر عورت ہونا بھی کیا مصیبت ہے۔ اس میں کیا کمی ہے جو مرد کام کر سکتے ہیں وہ میں نہیں کر سکتی۔ ابتدا میں اس نے اپنے عمزاد ملا صالح کی بیٹی جو شاعرہ بھی تھی اس سے بڑی متاثر تھی۔ اس کا چچازاد جو اس کا ہونے والا شوہر تھا، اس وقت نجف اشرف میں پڑھتا تھا۔ ہزاروں لڑکیاں اس کے چاہنے والیاں تھیں لیکن اس کو بھی اُم سلمہ کی طرح فلسفہ کا مضمون ہی بڑا پسند تھا۔ ناول میں اس کو جمیلہ ہاشمی نے اس طرح بیان کیا ہے:

"تعجب ہے کہ میں اتنے عرصے سے یہ راز جاننا چاہتی تھی کب سے پڑھتی چلی آئی تھی۔ خدااور آدمی کا رشتہ اور ایسی بہت سی باتیں مگر مجھے کبھی کچھ نہیں ہوا۔ مجھ پر کبھی بے ہوشی طاری نہیں ہوئی، میرا دل کبھی زور سے دھڑکا نہیں اور ہانی نے محض یہ سن کر کہ اس کے اندر خدا ہے جان دے دی، وہ ہمیشہ اپنے باپ، چچا اور سسر کو یہ کہتی تھی کہ آپ لوگ دنیا دار لوگ ہو، آپ کو سلسلہ خانقاہی کی روحانیت کا علم نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہتی کہ اندھا دھند کسی عقیدے کی تقلید بھی نہیں کرنی چاہیے۔ انسان کو اپنے عقیدے کو ہمیشہ خالص کرتے رہنا چاہیے"۔(۱۶)

طاہرہ اکثر یہ کہتی تھی کہ عربوں کی دوسری قوموں پر فضیلت ان کی اپنی عزت اور قوت مدافعت کی وجہ سے ہے۔ عرب اپنے چہروں کی خوبصورتی اپنی سخاوت، اپنی شجاعت اپنی قوت گفتار پختہ حکمت عملی وفا اور عزت نفس کی وجہ سے باقی قوموں سے ممتاز ہیں اور عربوں سے ہی حضرت علیؓ باب علم تھے اور چوتھے خلیفہ راشد بھی تھے۔ شجاع اور بہادر بھی تھے۔ انہوں نے اسلام کے کئی دشمنوں کو جہنم واصل کیا۔ علیؓ ابن ابی طالب پر جمہوریت کا خاتمہ ہو گیا۔ طاہرہ علم کی ہمیشہ ہی متلاشی رہی وہ ہر وقت تعلیم حاصل کرتی رہی۔ کتب خانوں سے آزادانہ کتابیں لے کر پڑھتی رہی اور ان چیزوں کو بھی موضوعِ بحث کرتی جس سے لوگ ڈرتے بھی تھے۔ اس کی علم پروری کی مثال جمیلہ ہاشمی نے ناول میں اس طرح دی ہے:

"ایران کے دستور کے خلاف وہ باپ کے کتب خانوں کا استعمال آزادانہ کرتی تھی اور اسے ایسی باتیں بھی جاننا تھی جنہیں جاننا عورت کے لیے معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ وہ شعر کہتی اور بلا کی نقطہ چین اور مغرور تھی اس کو حافظ کا کلام بھی زبانی یاد تھا"۔(۱۷)

اکثر ایسے شعر کہتی جو مرثیہ نہیں ہوتا تھا۔ ایسے شعر وہ بچپن سے کہتی آرہی تھی۔ ان اشعار میں معصومینؑ کی تعریف بھی نہیں ہوتی تھی۔ پتہ نہیں کہ اس کو عوام سے عشق کیوں تھا؟ ان کے دکھوں کا رونا روتی تھی۔ اس چیز کا بھی پتہ نہیں کہ اس کا قرار وسکون کس نے چھینا تھا یہاں پر ناول میں ان کا شعر بھی ہے:

گھر بتو افتادم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بر

وشرح دہم غم ترا نکتہ بے نکتہ ہو بہو(۱۸)

اکثر وہ یہ سوچتی ہے کہ یہ زندگی لا حاصل ہے۔ کچھ نہ ہونے پر دلالت اس کی مجبوری قسمت پر شاکر رہنے کے لیے ایک تاریخ فلسفہ اور زمانے کی بے سفاکی تھی۔ وہ کم مائیگی انسان کے لیے کوئی بھی امید نہیں ہے اور نہ ہی کوئی راستہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کبھی جمشید بھی ایران کا حکمران تھا۔ وہاں ہی درندے نما انسان اپنی مجلس مشاورت کرتے نظر آتے رہے اور اس جام جم والے بادشاہ جمشید کی ہنسی اڑاتے ہیں اور شاہ بہرام کے مقبرے پر جنگلی گدھے اپنا پاؤں مارتے ہیں، جہاں پر یہ آسودہ خاک ہے اور اس کا سر بالکل نیچے موجود ہے۔

قرۃ العین کے مطابق اس کی سوچ یہ کہتی ہے کہ جہاں کسی زمانے میں صوفی اور عالم بیٹھ کر اپنی مجلس میں ما بعد الطبیعات سے متعلق مختلف موشگافیاں کرتے تھے۔ وہ انبیاء اور اولیاء اللہ کی کہی ہوئی باتوں میں سچائیاں ڈھونڈتے اور نقب لگاتے کبھی یہ کہتے کہ اس دنیا میں سب جھوٹ ہے۔ بس ایک بار پھول کھلا اور مرجھا کر خاک میں مل گیا۔ ام سلمہ عام لڑکی نہیں تھی بلکہ چھوٹی عمر میں کافی سمجھدار ہو چکی تھی۔ جب وہ تاریخ کا مطالعہ کرتی تو یہ سوچتی کہ بادشاہوں نے تکلیفیں اٹھا کر ۲۰۰ سال تک مذہب و ملت کی جو خدمت کی ہے۔ اس کے باوجود بھی بادشاہ عام فقیر لوگ جو خانقاہ کے اندر بیٹھے ہیں۔ عوام کو دین و دنیا کی تعلیم دینے سے خائف نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ عوامی شعور ہے جو ان لوگوں کی درسگاہوں سے مل رہا ہے۔ بادشاہ یہ حق دوسروں کو دینا نہیں چاہتے۔ ملا محمد شادی کے بعد اپنی بیوی ام سلمہ کو اکثر ایسی باتیں بتاتا جو اس نے نجف اشرف میں دوران تعلیم اکثر علماء سے سینہ بسینہ سنی تھیں کہ یورپ خاص طور پر جو انتہائی شمال میں واقع ممالک ہیں۔ وہ بحیرہ کیسپیئن سے بھی پرے نہ جانے مشرق و مغرب میں کہاں کہاں پہنچ چکے ہیں۔ وہ کمزور طاقت والے ممالک کے ساتھ ایسے ایسے معاہدے کرتے ہیں کہ ان ممالک کو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ جب ان ممالک پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اکثر مسلم ممالک ہی ان کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ سب تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اُمت میں وحدت نہیں ہے اور دن بدن ان کے ممالک یورپی مقبوضات بنتے جا رہے ہیں اور مغربی لوگ بڑے چالاک ہیں۔ مقامی بدمعاشوں سے مل کر اس غلامی کو انقلاب کا نام دے رہے ہیں۔ وہ اکثر گھر کے اندر ایک کمرے میں اپنے آپ کو بند کر لیتی۔ جب وہ کسی سے ناراض ہوتی ہے تو اس منظر کو جمیلہ ہاشمی نے اس طرح ناول میں بیان کیا ہے:

"وہ اس اندرونی کمرے کی طرف بڑھا جہاں ناراض ہو کر وہ کبھی کبھی معتکف ہو جایا کرتی تھی یا نہایت سوچ بچار کرنے کے لیے گویا مراقبے میں چلی جاتی تھی۔ جب اس پر مایوسی کے دورے پڑتے تھے تو مناجاتوں میں کھو کر اپنی گویا بیماری کا علاج کرتی تھی۔ قران پاک کی تلاوت کرتے ہوئے روتی رہتی اور شعر کہتی کہتی ہی چلتی جاتی اور آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگا ہوا ہوتا"۔(۱۹)

اُم سلمہ کو یہی سوچ بار بار کھائے جاتی تھی کہ آخر بنو فاطمہ پر ہی ظلم کیوں ہو تا رہا۔ اگر عباسی تخت پر بیٹھے تو انہوں نے بنو فاطمہ پر ظلم و ستم کے باپ کھولے۔ جب اُموی حکومت آل رسولؐ پر زندگی تنگ کر دی تو بنو عباسؓ نے امام جعفر صادقؑ کے سامنے بھری مجلس میں یہ کہا کہ حضور اُمیہ سے نکلنے کی کوئی راہ بتائی جائے تو انہوں نے کہا کہ بات تو معقول ہے اور دل کو بھی لگتی ہے مگر اس لیے اس پر اتفاق نہیں کرتا کہ حکومت آگے جا کر یعنی ابو جعفر منصور کو ملے گی۔ حضرت کی پیشن گوئی آگے چل کر سچ ثابت ہوئی۔ امام کا وجود تو ہر زمانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ بہائی لوگوں کا مذہب بھی یہی تھا لیکن یہ لوگ جو امام غائب کا تصور دیتے ہیں یہ کہاں تک درست ہے۔ آیا کہ امام کے غائب ہونے سے رشتہ ہدایت کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ یہاں اُم سلمہ کی بار بار سوچ تھی کہ زمانے میں یونانی تراجم نے فلسفے میں انقلاب برپا کر دیا۔ جہاں تک جمیلہ ہاشمی کے تاریخی ناولوں کا تعلق ہے وہاں فکشن کے ساتھ ساتھ تاریخ کا بھی حسین سنگم نظر آتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے صرف دو تاریخی ناول لکھے ہیں عبدالحلیم شرر اور نسیم حجازی نے زیادہ تاریخی ناول لکھے ہیں۔ شرر کے ناولوں کے کرداروں میں یا تو ہمیں پوری طاقت نظر آتی ہے یا وہاں انتہائی پارسائی نظر آتی ہے، جبکہ جمیلہ ہاشمی کے ہاں ایسا بالکل نہیں ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے نسائی کرداروں کے علاوہ کبھی خواب کی اور کبھی خطوط کی تکنیک کو استعمال کیا ہے۔ کہیں کہیں آپ بیتی کی تکنیک کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ایران میں ہر تحریک جس کی روح رواں زری تاج یعنی قرۃ العین طاہرہ تھی خطوط کے ذریعے چل رہی تھی۔ یہ انقلابیوں کے خطوط تھے جو شہر شہر لوگوں کو بادشاہ کے خلاف اکسا رہے تھے۔ ابتداء میں بابی تحریک نے حکومت وقت کو امتحان میں ڈال دیا تھا لیکن قیادت کے گرفتار ہونے اور تہہ تیغ ہونے سے تحریک دن بدن ختم ہوتی چلی گئی۔ شیخ احمد احسائی اور سید کاظم رشتی جو کہ تحریک کے روح رواں تھے سب ختم ہو گئے۔ اُم سلمہ سب کچھ دیکھتی اور برداشت کر رہی تھی۔ اُم سلمہ کے چچا کو بھی مسجد میں قتل کر دیا گیا۔ بادشاہ کو اگر پتہ چلتا کہ بہائی تحریک کے ادنی رکن ہیں ان کو بھی پھانسی کا حکم

سنایا جاتا۔ دراصل یہ قرۃ العین ہی تھی جو اس تحریک کی آخری کڑی تھی جو آخر میں قتل کی گئی اور جب تک یہ زندہ رہی اپنے اور پرائیوں کی لاشیں دیکھتی رہی اور صبر کرتی رہی۔ ناول کا یہ مرکزی کردار صبر کا استعارہ بھی ہے کیونکہ ناول کے شروع میں شہدائے کربلا کے صبر کو بھی نسائی کردار ہی برداشت کر رہے ہیں۔ قرۃ العین جو سید کاظم رشدی کے خطوط سے پہلے اُم سلمہ تھی باب سے ملنے سے پہلے قرۃ العین تھی اور بردہ کے ملنے کے بعد زری تاج تھی۔ اگرچہ پلاٹ سازی میں شرر کا کوئی ثانی نہیں جبکہ نسیم حجازی بھی پلاٹ میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ شرر کے ہاں اصلاحی ناول یا مقصدی ناول کا انشائیہ ہرگز نہیں ہوتا اور پڑھنے والوں کے لیے ایسا ماحول تخلیق کرتے ہیں کہ ان کے کرداروں میں بعض اوقات خامیاں محسوس ہوتی ہیں۔ پُر فریب سچ ناول کا لازمی جزو ہوتا ہے جیسا کہ جمیلہ ہاشمی کے ہاں ایسا ضرور ہمیں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "یہ معتزلہ تھے جو دربار پر قابض تھے اور علم دوست بادشاہ کے دماغ کو پھیر دینے کا باعث بنے تھے۔ علماء اس جور و ستم کے زمانے میں قتل کر دیے گئے اور کلمہ حق کہنے کے جُرم میں تختہ دار پر چڑھائے گئے لوگ سچی بات کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ فرات کے کناروں پر پُر شکوہ محلات میں رہنے والے اصل میں نہایت بے بس ہو گئے تھے۔ وہ علم و فضل کے دلدادہ تھے لیکن نئے فتنے کے لیے تیار نہ تھے"۔(۲۰)

بطور نمونہ ناول کا اکتساب پیش کیا گیا ہے۔ اس میں تاریخ اور فکشن دونوں یکجا ہیں لیکن پر فریب سچ کے کتنی قریب تحریر ہے اور یہ ایک مردانہ سوچ کی بجائے نسائی سوچ ہے اور جو تاریخ کے ورق کو اپنی مرضی سے تبدیل کر رہی ہے۔ یہاں ایک کامیاب فنکشن نگار کا کمال ہوتا ہے۔

بابی تحریک کا ایسا کردار ہے جس کے مرنے کے بعد تحریک دم توڑتی جا رہی ہے اور بابی تحریک کے حروف ہی تھے تین بچوں کی ماں جو کم عمری میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئی تھی۔ اس نے تمام معاشرتی ازدواجی اور سیاسی حدبندیوں کو ایک طرف رکھ کر وہ آزادی نسواں کی اس وقت علمبردار تھی جس کا نام آزادی نسواں ایران میں آج بھی زندہ ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تاریخ کا ایک اہم واقع ہے۔ اس کے بعد تاج برطانیہ نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا جس کے بعد ملک میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں جس نے ایک نئی فکر کو جنم دیا۔ اسی فکر نے انیسویں

صدی میں اصلاحی تحریکوں کو جنم دیا جس میں سر سید تحریک ایک بڑی تحریک ثابت ہوئی۔ اسی تحریک نے نہ صرف سیاسی بیداری اور شعور پیدا کیا بلکہ تعلیمی سطح پر بہت سی مثبت تبدیلیاں پیدا کیں۔ لوگوں کو مغربی نظریات اور فلسفے سے بھی متعارف کروایا۔ سر سید تحریک کی مقصدیت، سلاست و سادگی اور نثری ذریعہ اظہار نے اُردو زبان و ادب میں ایک نئی کروٹ کو جنم دیا۔ جہاں دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی گئی ناول کی ابتدائی صورت بھی سر سید تحریک کے اہم رکن مولانا نذیر احمد کے ہاں نظر آتی ہے۔ مولانا نے ابتدائی نثری کہانیوں کی شکل میں ناول کی صورت دی۔ اس کے بعد کئی موضوعات پر قلم اُٹھایا اور بہت سے نظریات اور افکار کو کہانی کی شکل دی۔

مغرب میں ناول ایک اہم صنف کے طور پر متعارف ہوا۔ نذیر احمد نے نثر میں ایک نئی طرح ڈالی انھوں نے اُردو نثر کو فورٹ ولیم کی داستانوں کے عشقیہ اور رزمیہ قصوں سے نکال کر زندگی کے عملی دائرے کو موضوع بنایا۔ لوگوں نے خوشی سے خیر مقدم کیا۔ نذیر احمد نے تعلیم نسواں جیسے مسئلے کو سنجیدگی سے لیا اور اسے اپنا موضوع بنایا۔ اس دور میں بھی عورت کے ساتھ غیر مساوی سلوک کیا جاتا تھا۔ عورت پر زندگی کا دائرہ شدید تنگ تھا۔ عورت کا واحد مقصد نسل انسانی کا فروغ سمجھا جاتا تھا۔ رسومات کی آڑ میں عورت کا استحصال ایک عام بات سمجھی جاتی تھی۔ سب سے پہلے نذیر احمد نے اصلاح نسواں کے لیے آواز بلند کی اور اسے اپنے ناولوں "مراۃ العروس"، "بنات النعش" اور "محصنات ایالی" سب میں ان کے حقوق و فرائض اور تربیت پر زور دیا گیا۔ ان ناولوں میں عورتوں کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ کیسے اپنی تربیت سے معاشرہ بہتر بنا سکتی ہیں۔ ابتدائی ناول نگاروں کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں گھریلو زندگی کے اُمور، عورتوں کے حقوق، ان کی اصلاح اور تعلیم کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، راشد الخیری، مرزا محمد سعید نے اپنے ناولوں میں حقوق نسواں اور مقصدیت کو موضوع بنایا۔

اردو ناول کے نسائی کردار شروع سے ہی بہت اہم ہیں۔ مثال کے طور پر مراۃ العروس میں اکبری اور اصغری کا کردار بڑا اہم ہے۔ اس کے علاوہ اسی ناول میں ماما عظمت کا کردار منفی طرز کا ہے۔ ایک کٹنی کا کردار ہے جو فراڈ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ امراؤ جان ادا میں امراؤ کا کردار مرکزی کردار ہے۔ مرزا رسوا نے اس ناول میں جہاں لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کے علاوہ خانم کا کردار، بسم اللہ کا کردار سبھی بہت اہم نسائی کردار

ہیں جنہوں نے اردو ناول میں خشت اوّل کا کام کیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی دراصل اپنی پسند کے کردار ڈالتی ہیں۔ "دشت سوس" میں منصور حلاج کا کردار جس کے اردگرد پورا ناول گھومتا ہے۔

ابتدائی دور میں بہت سے ایسے ناول لکھے گئے جو عورتوں کی زندگی کے متعلق تھے جن میں عورتوں کے کردار جاندار تھے۔ ناول نگاروں نے اس میں عورتوں کی بہت سی خوبیاں بھی بیان کیں اور اسے سماجی حیثیتوں میں بھی نمایاں کیا۔ راشد الخیری جنہیں مصورِ غم بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بھی عورتوں کے حق میں آواز بلند کی اور ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق بھی بہت سی باتیں لکھیں۔ ابتدائی دور میں ناولوں کے کرداروں میں بیوی، ماں، بہن، بیٹی اور طوائف کے کردار کے طور پر دکھائی گئی ہے۔ ادب میں زیادہ تر ان کے حقوق اور حیثیت پر بھی بحث نظر آتی ہے۔ عصمت چغتائی نے دشمن کے روپ میں سماجی رویوں اور تربیت کو اجاگر کیا ہے۔ عزیز احمد کے ناول ہوس میں کردار مسلم معاشرے کے گھٹن زدہ ماحول کی عکاسی کرتے ہیں جس میں خواتین صرف چار دیواری تک محدود کی جاتی ہیں اور اسی وجہ سے وہ زندگی کے عملی تجربے حاصل کرنے سے محروم رہ جاتی ہیں۔ یہی وجہ بنتی ہے کہ وہ مرد کے سفلی جذبات کا شکار ہوتی ہیں۔ یہ خواتین اپنی کم علمی یا نادانی کی وجہ سے نقصان اٹھاتی ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ناولٹ میں ہندوستانی عورت کا کردار پیش کیا جس کا تعلق دیہات سے ہے جو مختلف رشتوں کی ذمہ داریاں نبھارہی ہیں مگر اس کی اپنی کوئی پہچان نہیں ہوتی جس کی وجہ سے اس کی اپنے ہی گھر میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

جہاں جہاں نسوانی کردار ظلم و استحصال کے اظہار کے لیے وضع ہیں۔ عبداللہ حسین کے ناول اداس نسلیں میں عذرا ایک ایسا کردار ہے جس کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہے وہ ہر طرح کے حالات میں اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہے مگر عذرا کا کردار ان ذہنی فاصلوں کو دکھاتا ہے جو مختلف حالات میں جنم لیتے ہیں۔ احسن فاروقی کے ناولوں میں اودھ تہذیب کا عکس پیش کیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناول گردش رنگ چمن میں ایک ایسی عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو کہ گانا گانے والی ہے اور یہ خواہش رکھتی ہے کہ اس کی شادی نواب سے ہو جائے مگر پھر نواب کی موت واقع ہو جاتی ہے جس کے باعث دلنواز بیگم کو وقت دوبارہ کوٹھے کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ لیکن اس نے اعلیٰ طوائف کی زندگی پر موت کو ترجیح دی۔ قرۃ العین طاہرہ کے کردار عورت کی سائیکی کو بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے ناول آخری شب کے ہمسفر کے کردار دیپالی سرکار کو دیکھا جائے تو یہ کردار جذبات اور خلوص کے ذریعے انقلاب کی کوشش کرتی ہے۔ دیپالی اپنے جذبات غلط شخص پر صرف کرتی

ہے۔شوکت صدیقی بھی اپنے ناول میں عورت کی بے بسی کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں کہ عورت معاشی طور پر کمزور ہونے کی وجہ سے مردوں کے استحصال کا شکار نظر آتی ہے۔اسی طرح شوکت صدیقی کے دوسرے ناول جانگلوس میں بھی کئی نسوانی کردار ہیں انسان کی مجبوریوں اور اس کی ذات کے اچھے بُرے پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔

ناول کی صنف کو ہمیشہ کسی خاص موضوع کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے ۔بہت سے ناول نگاروں نے عورت کے مسائل،اس کی اصلاح اور اس کے دکھوں کا حال بیان کیا ہے اور یہ روایت اب تک برقرار ہے۔

تانیثیت: بنیادی مباحث

تانیثیت ایک وسیع المعانی تھیوری ہے جس میں عورتوں کے مختلف مسائل اور رویّوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ معاشرے میں خواتین کے استحصال جنسی فرسودگی، خاندانی رشتوں میں تشخص، قانونی عدم تحفظ کی تلاش تانیثیت ہے۔

تانیثیت کی متعدد تعریفیں درج ذیل ہیں:

اردو لغت کے مطابق :

"تانیثیت کا مطلب محض تانیثیت نسائیت اور مردانگی میں فرق نہیں بلکہ عورت کا بطور اپنی ذات کا شعور اور بطور انسان شناخت کا مطالبہ ہے"۔(۲۱)

انسائکلوپیڈیا فیمنزم کی تعریف یوں کرتا ہے کہ:

"فیمینزم اس کا نام ہے کہ معاشرے میں عورت مظلوم ہے اور اس کا استحصال کیا جاتا ہے اور اس صورتحال کو بدلنے کی شعوری کوشش کا نام ہے"۔(۲۲)

انسائکلوپیڈیا فیمنزم کے مطابق

"فیمنزم ایک سماجی تحریک ہے جو عورتوں کے مساوی حقوق کے لیے جدوجہد کرتی ہے"۔(۲۳)

اس سلسلے میں انیس ہارون کا کہنا ہے:

"عموماً اس تحریک کو مغرب زدگی اور خواتین کی بے لگام آزادی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ آپ نے خواتین سے بھی یہ سنا ہو گا کہ "ہمارے ملک میں عورت دوہرے استحصال کا شکار ہے یا اُن پر بڑا ظلم ہوتا ہے"۔ مگر دوسرے ہی سانس میں وہ کہتی ہے کہ "میں فیمنسٹ نہیں ہوں"۔ ان میں پیشہ ور خواتین سے لے کر ادیب و شاعر بھی شامل ہوتی ہیں جو ہمیشہ عورتوں کے حق کے لیے آواز بلند کرتی ہیں مگر اپنے آپ کو "فیمنسٹ" کہلانا پسند نہیں کرتیں کیوں کہ ان کے ذہن میں بھی یہ ایک مغربی نظریہ ہے جیسے "مردوں سے نفرت" انتہا پسند نسوانیت اور گھر تباہ کرنے کا محرک سمجھا جاتا ہے۔ یہ دراصل اُسی پروپیگنڈہ کا شکار ہیں جو فیمنزم کو صرف انتہا پسندانہ نظریات سے ہی جانچتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ خواتین پر ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھانا یا ان کے حقوق کی بات کرنا "فیمنزم" ہے"۔(۲۴)

تاریخی طور پر فیمنزم کی بدلتی شکل اور اس کی درجہ بندی کے لیے ماہرین نے اسے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:

کشور ناہید کہتی ہیں:

"اس تحریک کی اپنی صورتیں ہیں اور ان میں اتنا تنوع ہے کہ بعض دانشور اسے تحریک کی بجائے تحریکیں کہتے ہیں یعنی فیمینزم نہیں فیمنزمز"۔(۲۵)

پہلا دور: انیسویں صدی میں شروع ہوا اور بیسویں صدی کے اوائل تک جاری رہا۔ اس ابتدائی دور میں خواتین کا مطالبہ مردوں کے مساوی حقوق تک تھا۔ جس میں قانونی و سیاسی حقوق کے لیے جدوجہد کی گئی۔

دوسرا دور: ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کا ہے۔ اس دور میں خواتین کا تقاضا ذریعہ معاش کی جدوجہد گھریلو سطح پر اپنے مقام کی تشخیص کے علاوہ از جنسیت سیاسی حقوق رہا۔

تیسرا دور: ۱۹۹۰ء سے اکیسویں صدی کے اوائل تک ہے۔

عصر حاضر میں حقوق نسواں کے حوالے سے سرگرمیوں کے ذریعہ سے جس قدر آگہی پھیل رہی ہے، اسے حقوق نسواں فیمینزم کا چوتھا دور کہنا غلط نہ ہو گا۔

فیمنزم کی پہلی لہر / موج

انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے نصف اوّل تک کے عرصے کی ہے۔ اس تمام عرصے میں عورتوں کی ملازمت ملکیت کے حقوق بطور بیوی حقوق اور وہ ووٹ کے حق جیسے مسائل کے لیے عملی طور پر جدوجہد کی گئی اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ عورت کو دیگر انسانوں کی طرح انسان ہی سمجھا جائے۔ ان کو تعلیم کا حق دیا جائے۔

محمد عقیل لکھتے ہیں:

"تانیثیت ایک نیا فکری تصور ہے جو بیسویں صدی کے نصف کے بعد مغربی فکر اور تنقیدی تصورات میں روز بروز اپنا دباؤ ڈالتا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی احتجاجی صورتوں کو بھی واضح کرتا جا رہا ہے۔ احتجاج ان معنوں میں مرد کی بنائی ہوئی اس سوسائٹی میں نہ صرف عورتوں کی

> زندگی میں کم مواقع فراہم کیے جاتے ہیں بلکہ زندگی کی ارتقائی پیش قدمیوں میں عورت کو یا تو پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے یا اس کی کوششوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی"۔(۲۶)

دوسری جنگ عظیم کے بعد اس تحریک نے شدت اختیار کی اور بعض مقامات پر عملی کامیابی بھی حاصل کی۔ یورپ میں اس تحریک کے آغاز کی وجوہات جاننے کے لیے، فرانس وانقلاب فرانس کے بعد کے حالات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ چارلس موریس نے ۱۷۹۱ء میں فرانس کی قومی اسمبلی میں تعلیم نسواں کے حوالے سے آواز اٹھائی۔ اس منشور کے مطابق مردوں کو عام تعلیم دینے کے حوالے سے بات کی گئی جب کہ خواتین کو بنیادی گھریلو تعلیم دینے تک محدود رکھا گیا۔ اس جواز کی یہ دلیل دی گئی کہ مرد کو تو دنیا سنبھالنی ہے، لہٰذا مرد کو اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے اور چونکہ عورت اُمور خانہ کی ذمہ دار ہے لہٰذا اس کے لیے گھریلو اور بنیادی تعلیم کافی ہے۔ اس کے دور میں ایک برطانوی خاتون میری وال اسٹون کرافٹ نے ۱۷۹۲ء میں A vindication of the Rights of Women کے عنوان سے ایک پمفلٹ لکھا۔ جس میں انھوں نے بیان کیا کہ عورت کی حیثیت صرف ایک بیوی کی ہی نہیں ہے بلکہ وہ بھی سماج اور ملک کا ایک لازمی حصّہ ہے اور اس حیثیت سے وہ بھی بنیادی حقوق کی حقدار ہے۔ وال اسٹون کرافٹ کے علاوہ امریکی ادیب مارگریٹ فلر اور جان اسٹورٹ نے بھی تحریک تانیثیت کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انیسویں صدی میں مارگریٹ فلر کی کتاب Woman in the Nineteenth Century منظر عام پر آئی جس کی پہلی اشاعت ۱۸۴۳ء میں ہوئی۔ تانیثیت کی حمایت میں کسی مرد ادیب یا مصنف کی جانب سے سب سے پہلے جان اسٹورٹ مل نے ۱۸۶۹ء میں آواز بلند کی۔ اس حوالے سے ان کی ایک کتاب بعنوان The Subjection of Woman شائع ہوئی۔ مزید برآں مذکورہ بالا کتاب میں انھوں نے حقوق نسواں کی حمایت کی ہے نیز اس کے فلسفیانہ اساس کے پہلو بھی اجاگر کیے۔ مِل نے معاشرے میں خواتین کے مساوی رتبہ کا ترقی پسندانہ نظریہ متعارف کروایا اور حقوق نسواں کے مخالف سب اُصول و قوانین پر سخت تنقید کی۔ مل نے مرد سالار معاشرے کی تبدیلی پر زور دیا نیز عورت کو ایک تابع کی حیثیت سے بدل کر برابر کا شریک سمجھے جانے پر بھی زور دیا۔

نیویارک میں پہلی مرتبہ ۱۸۴۸ء میں عورتوں اور مردوں نے حقوق نسواں کے لیے باقاعدہ اجلاس کا انعقاد کیا۔ جس میں Declaration of Rights and Sentiments کے عنوان سے ایک قرارداد پیش

کی گئی۔اس قرارداد میں ایک مضبوط عورت کا خاکہ پیش کیا گیا۔شاملین اس بات کے معترف بھی نظر آئے کہ ایک لمبے عرصے تک عمداً خواتین کو تعلیم سے محروم رکھا گیا۔اسی وجہ سے میڈیکل و وکالت جیسے اہم شعبوں میں خواتین کا وجود نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔علاوہ ازیں خواتین کو سیاست سے بھی دور رکھا گیا ہے اور نہ ہی انہیں ووٹ دینے کا حق دیا گیا۔اس زمانے میں یہ تصور پایا جاتا تھا کہ سیاست کے لیے ذہانت و فطانت درکار ہے۔جب کہ عورت قدرتی طور پر ذہانت و فطانت اوردانشوری سے محروم ہے ۔حقوق نسواں کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو مزید تقویتAbolitionist Movementتحریک کے ذریعے ملی جو کہ انیسویں صدی میں غلامی کے خلاف برسرپیکار تھی۔کیونکہ مردوں کی جانب سے لگائی گئی پابندیوں کو غلامی ہی کے مترادف سمجھا جانے لگا تھا۔انیسویں صدی میں امریکہ میں خواتین کے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے والوں میں نمایاں نام لوسی اسٹون(Lucy Stone)الزابیتھ کیڈی اسٹنٹون(Elizabeth Cady Stanton) اور سوزین بی(Susan .B)کے ہیں۔۱۸۶۹ء میں لوسیاسٹونٹن نے جولیاوارڈہو(Julia ward howe)اور جوسفن رفین (Josephine Ruffin) کے ساتھ مل کر بوسٹن میں American Woman Sufferage Associationکی بنیاد رکھی ۔لوسی بیس سال تک خواتین کے ایک رسالے کی مدیر بھی رہیں۔اس کے علاوہ الزبیتھ کیڈی اسٹنٹون حقوق نسواں کی ایک سرگرمActivist تھی جو غلامی کے خاتمے کے ساتھ حقوق نسواں کے لیے بھی جدوجہد کرتی رہیں۔جہاں الزبتھ نے ماں کی حیثیت کو عورت کی ایک عظیم ذمے داری مانا اس کے ساتھ ہی سماج کی حدود قیود میں قید ماں کے حق میں آواز بھی بلند کی۔الزبتھ کا ایک اور اہم کارنامہ ووٹ کے حق سے محروم عورت کے حق میں احتجاج کرنا اور ۱۸۴۸ء میں مزاحمتی قرارداد Decalaration of Sentimentsکی تیاری میں اہم کردار ادا کرنا بھی ہے۔الزابتھ نے عورتوں پر چرچ کے ذریعہ لگائی گئیں سماجی اور مذہبی رسوم ورواج سے بھی پردہ چاک کیا ہے۔مرور زمانہ کے ساتھ بائبل کی غلط و پر تعصب تشریح جس میں خواتین بہت سے سماجی و معاشرتی حقوق سے محروم سمجھی گئی تھیں،اسٹونٹن نے اس پر بھی آواز بلند کی بائبل کی اور ۲۱ خواتین پر مشتمل ایک ٹیم تیار کی جس نے بائبل کی تفسیر و تشریح پر نظر ثانی کر کے دو جلدوں پر مشتمل(Woman's Bible)شائع کی۔اس تفسیر میں بائبل کے وہ متون ہیں جو بالخصوص خواتین سے متعلق ہیں۔اسٹونٹن کا یہ مقصد بھی تھا کہ مذہبی کتب میں خواتین کو کم درجہ کی خلقت نہیں تصور کیا گیا بلکہ یہ بعد کی تشریحات ہیں جو کہ چرچ نے کم عقلی میں تھوپی ہیں۔

ورجیناوولف

جنگ عظیم اوّل کے بعد دنیا بھر میں گویا سیاسی، معاشی، سماجی تبدیلیوں کا طوفان عظیم برپا ہو گیا تھا۔ انگلستان میں بھی تبدیلیوں کا ایک نیا دور دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہی تبدیلیوں میں سے ایک حقوق نسواں کا مسئلہ بھی زیر بحث تھا۔ اس حوالے سے ایک بڑا نام ورجیناوولف کا ہے۔ جس نے خواتین کی ادیبانہ نظریہ سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے ادبی کارنامے اس دور کے عکاس ہیں۔ ان کی دو مشہور کتابیں A Room of One's Own (۱۹۲۹ء) اور Three Guineas (۱۹۳۸ء) نے ۱۹۶۰ء اور بعد میں آنے والی خواتین ادبا کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئیں اور متاخرین کے آثار میں وولف کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ ولف نے ہر شعبۂ زندگی میں مرد و عورت کے مابین تفریق پر مبنی سوچ کو محسوس کیا۔ وولف نے ہر دو طرز زندگی گھریلو و معاشرتی میں خواتین کو مردوں کے زیر اثر و محکوم ہونے پر بھی آواز بلند کی۔ اسی طرح سامراجیت، نو آبادیت اور فاشزم جیسے نظریاتی مباحث میں بھی خواتین کی کمتر حیثیت پر بھی بات کی۔ وولف کے مطابق عورتوں کے پیچھے رہ جانے کا اصل قصوروار مرد سالار معاشرہ ہے۔ وولف نے مرد ادبا کے آثار کا عمیق مطالعہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ طاقت و قوت کا یہ غیر متوازی رویہ جہان ادب میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کے ادب میں خواتین کی نمائندگی کم درجہ کی اور غیر فعال نظر آتی ہے۔ اس رویہ پر احتجاج کرتے ہوئے وولف نے شیکسپیئر کی بہن (Judith Shakespeare) کا خیالی کردار تخلیق کر کے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ شیکسپیئر کی بہن عورت ہونے کی وجہ سے عدم توجہ کا شکار رہی اور تخلیقی صلاحتیں نہ ہونے کے خاطر خواہ پذیرائی سے محروم رہی۔ وولف نے Androgyny کا فلسفہ بھی پیش کیا جو کہ یونانی الفاظ کا مرکب ہے۔ Andro یعنی مرد اور gyne یعنی عورت، یعنی مردانہ و زنانہ دونوں خصوصیات کا حامل انسان ہے۔ وولف نے اس نظریے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بشریت کی نمائندگی اسی حال میں ممکن ہو سکتی ہے جب ایک لکھاری، مرد اور عورت دونوں کی سوچ و فکر کا مرکز جامع ہو۔ وولف نے یہ نظریہ بھی پیش کیا کہ اگرچہ مرد و عورت کی تخلیق میں جنسی فرق ضرور نظر آتا ہے لیکن اس کا عقل و دانش سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس میں کسی فطری فرق کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ وولف کی کتاب A Room of One's own انثیت کے ادب میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب صنف، جنس اور تانیثی تنقید عنوانات پر بنیادی متن کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب دراصل وولف کے کیمبرج یونیورسٹی میں خواتین کو گاہے بگاہے دیئے گئے لیکچرز کا مجموعہ ہے۔ وولف نے خواتین کو اس بات

سے آگاہ کیا کہ اگر وہ مصنف یا ادیب بننا چاہتی ہیں تو لازم ہے کہ پہلے وہ خود کفیل ہوں اور الگ رہائش رکھنے کے قابل ہوں۔

Three Genieas میں وولف نے خواتین کو بالخصوص تعلیم یافتہ خواتین کیمنسٹوں کو مخاطب کیا ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کو تشکیل دیں کہ جس میں مرد سالاری کو چیلنج کیا جاسکے۔ وولف نے اس کتاب میں ایسی سوچ اور رویوں کی شدت سے مخالفت کی ہے جن کے باعث خواتین ادبا کو جہان ادب سے باہر کر دیا جاتا ہے۔ وولف نے خواتین ادبا کی حوصلہ افزائی اور ان کی ادبی خدمت کی اہمیت اور قدردانی کے لیے ان کے گم شدہ متون کی تلاش اور اس کی فہم و تجزیہ پر بھی کام کیا۔Radical Feminismفرانس میں ووٹ کا حق خواتین کو حق رائے دہندگی ۱۹۴۴ء میں حاصل ہوا۔ اس کتاب کے ذریعہ معاشرے میں خواتین کی حیثیت کے حوالے سے تحریک ہوئی۔ اس کتاب کی تصنیف کا پس منظر خواتین کے ساتھ ہونے والا ناروا سلوک اور جبر و استحصال کی دردناک داستانیں ہیں۔ خواتین صرف امور خانہ داری و اولاد کی پرورش تک محدود چلی آرہی تھیں اور معاشی، سیاسی و جنسی خود مختاری سے مکمل طور پر محروم تھیں۔ اگر ذریعۂ معاش کی تلاش میں سرگرداں پائی جاتی تو بھی مساوی سلوک کی حقدار سمجھی جاتی تھی۔ ان تمام پہلوؤں پر سیمون دی بوائر نے فلسفہ وجودیت اور تاریخ کے مارکسی تجزیے کے نقطۂ نگاہ سے خاطر خواہ بحث کی ہے۔ سیمون دی بوائر نے The Second Sex میں دو اہم نکتے اٹھائے ہیں:

۱۔ عورت کو ہمیشہ 'غیر' کے زمرے میں محدود رکھا گیا۔

۲۔ نسائیت مردوں کا خود ساختہ تصور ہے۔

سیمون دی بوائر کے مطابق عورت مردوں کے اس معاشرے میں ہمیشہ سے ایک اجنبیت کے پردے میں رہی ہے کیونکہ معاشرے پر ہمیشہ سے ہی مردوں کا راج رہا ہے۔ معروف مقولہ کہ ''عورت پیدا نہیں ہوتی بلکہ بنا دی جاتی ہے'' (One is not Born,but rather, Becoms, a woman) سیمون دی بوائر کا ہیئت تخلیق شدہ ہے۔ یہ کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی جسے بعد میں متعدد زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اردو میں کشور ناہید نے 'عورت مرد کا رشتہ'' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ دوسرا ترجمہ یاسر جواد نے ''عورت'' کے نام سے ہی کیا ہے جو فکشن ہاوس لاہور سے ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ نظریہ فیمینیزم اور اس سے متعلق تحریکات کا دائرہ کار مغربی دنیا یعنی یورپ اور امریکہ تک محدود تھا اور وہاں پر بھی عام طور پر سفید

فام،انگریزی زبان، خواندہ اور متوسط طبقے کی خواتین تک ہی محدود تھا۔ اس اہم تحریک میں تیسری دنیا کی خواتین کے مسائل کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ استعمار اور سامراجیت کی فضا میں پنپنے والے معاشرے میں عورت کی حالت زار پر لب خاموش تھے۔ مغربی فیمینزم کے دو پہلو تھے۔ ایک صنفی مساوات کے حوالے سے حقوق کے مطالبے پر قائم تحریکات، اور دوسرا ادب میں عورت کے الگ و بااختیار تشخص پر مبنی ہے۔ علاوہ ازیں فیمینزم کے زیر اثر وجود میں آنے والے ادب بھی دو پہیے تھے۔ ایک تو خواتین کے بارے تخلیق کیا ہوا مردوں کا ادب اور دوسرا عورتوں کا تخلیق کردہ ادب۔ اردو ادب میں بالعموم خواتین کے مسائل کے حوالے سے، خواتین کے تخلیق کردہ ادب اور ادب پاروں کی تانیثی قرأت پر مبنی تنقیدات کو تانیثیت کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔

مغربی دنیا میں تانیثیت بطور تحریک و رجحان الگ الگ حیثیت میں نظر آتی ہے لیکن تیسری دنیا میں تانیثیت یا فیمینیزم منظم تحریک کی صورت میں نظر نہیں آتی بلکہ رجحان کی شکل میں جہان ادب میں یا احتجاجی و مزاحمتی سرگرمیوں میں نظر آتی ہے۔

گزشتہ صفحات میں نظریہ فیمینزم کی تاریخ اور اس کی مختلف شکلوں کے مطابق وضاحت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تمام نظریات کے علاوہ بھی اس کی دیگر تھیوریز ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایکو فیمنزم، بلیک فیمنزم، اسلام فیمنزم وغیرہ۔ لیکن ان تمام نظریات کی اقدار تقریباً یکساں اور مشترک ہی ہیں۔ ان تمام نظریات کا محور سماج و معاشرے کی جانب سے ہر سطح و ہر نوعیت پر کیے جانے والے استحصال کے خلاف مزاحمت اور خواتین کے حق میں آواز بلند کرنا اور حقوق نسواں کی آگاہی پھیلانا ہی رہا ہے۔ سماجی و معاشرتی حدود قیود کی پابند سلاسل خواتین ایک عرصے تک اپنے ساتھ ہونے والے استحصال کے اظہار سے بھی گریزاں نظر آتی ہیں لیکن جب شعور کی لہر اٹھی اور خواتین کو ہوش آیا تو انہوں نے اپنے ساتھ ہونے والے ہر استحصال کا برملا اظہار کیا اور یہ مزاحمت نہ صرف بھرپور طریقے سے جاری و ساری ہے بلکہ ہر آن ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

تانیثی تھیوری کی پیشکش میں ایلین شوالٹر کا نام بھی نمایاں ہے۔ ایلین کا عورت کے سماجی اور حیاتیاتی حوالوں سے سمجھنے کی طرف بہت اہم تنقیدی کام ہے۔ ان شولڈر کا تحقیقی و تنقیدی کام عورت کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے بھی بحث کرتا ہے۔ ایلین شووالٹر نے انتقادِ نسواں کی بنیاد رکھی:

"Gynocritics is related to feminist research in history, anthropology, psychology, and sociology, all of which have developed hypotheses of a female subculture including not only the ascribed status, and the internalized constructs of femininity, but also the occupations, interactions, and consciousness of women"(۲۷)

شووالٹر نے نسوانی تنقید کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا۔ ا۔

ا۔ نسوانیت

شوالٹر نے عورتوں کی تحریروں کی روشنی میں پہلے مرحلے کو نسوانیت کہا جو ۱۸۴۰ء سے ۱۸۸۰ء تک کا یورپ اور امریکہ کا معاشرہ ہے جس میں عورتوں کے حقوق کو پہلی دفعہ محسوس کیا گیا۔ اس دور کی عورتوں کی تحریریں یا عورتوں کے لیے مردوں کی تحریریں عورت کے بنیادی حقوق کی جنگ لڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ عورت ایک صنف کے طور پر اپنے حقوق کے دفاع کا تقاضا کرتی نظر آتی ہے۔ عورتوں نے مردوں کے مقابل دانش ورانہ برابری کا نعرہ لگایا۔ شوالٹر نے اس دور کے لیے میل سوڈونیم کا لفظ استعمال کیا ہے جو اپنی ساخت، لہجے، خصوصیات اور لفظیات کی وجہ سے مرد مرکز پہچانا جاتا تھا۔ اصل میں یہ تحریک برابری کے حقوق کی تحریک تھی جو عورتوں سے زیادہ انسانی احترام کا تقاضا لیے ہوئے تھی۔ جس طرح مارکسی معاشی فلسفے نے مزدور اور مل مالک کے تصور سے انسانی حقوق کی ایک نئی جہت متعارف کروائی تھی۔ اسی طرح سرمایہ داری کلچر کے زیرِ اثر بچوں کے حقوق اور اُن کی اخلاقی اور تعلیمی ضرورتوں کو ناگزیر قرار دیا گیا تھا۔ عورت کیا ہے؟ عورت کا سماجی تصور صنفی تفریق ہے یا فطری تفاوت کی بنیاد ہے، نسوانیت عورت کے متعلق ایسے سوالوں کے جواب دینے سے قاصر ہے یا ان سوالوں کی بنیاد پر قائم تحریک نہیں تھی۔ لہٰذا نسوانیت نے عورتوں کے حقوق کو ہی اپنا مقصد اعلیٰ سمجھا۔ جو ۱۸۸۰ء تک ایک نئی کروٹ لے لیتا ہے۔ یہ زمانہ انقلابِ فرانس کے بعد کا زمانہ تھا جب ہر کوئی جدید انسان کی عملی حالتوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔

۲۔ نسوانی تنقید یعنی دی فیمنسٹ کریٹسزم

شوالٹر نے دوسرے مرحلے کو نسوانی کہا ہے۔ یہ زمانہ ۱۸۸۰ء سے شروع ہو کر بیسویں صدی کے آغاز ۱۹۲۰ء تک کا ہے۔ اس دور میں مردوں کی تحریروں کو مطالعے کا مرکز نگاہ بنایا گیا۔ یعنی مردوں کی تحریروں میں عورتوں کو کس طرح پیش کیا گیا ہے؟ کیا عورت مردوں کے معاشرے میں برابری کی دعوے دار رہی ہے؟ مردوں نے عورتوں کو کس طرح سمجھا؟ کیا عورت مرد کے تناظر میں کم تر رہی یا اعلیٰ صفات کے ساتھ سماجی حرکت میں شامل تھی؟ تانیثیت نے مردانہ معیارات کو رد کرنے کے لیے بھی مرد کو اپنے مطالعات کے لیے ناگزیر سمجھا۔ بنیادی طور پر یہ مکتبِ تنقید Androcentric تھا اور میل اورینٹڈ تصورِ عورت کو پیش کرتا تھا۔ ایک عورت مرد کے تناظر سے کس طرح کم تر ہے اگر کم تر ہے تو احتجاج اور تنقید سے اس تفریق کو دور کیا جائے۔ عورت اور مرد کی سماجی حصّہ داریوں کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ مرد تخلیق کاروں کے ہاں عورت کا تصّور کس کس طرح پیش ہُوا ہے۔ مرد کا عورت کے نفسیاتی اور جذباتی حصار میں آنے کا بھی تجزیہ کیا جانے لگا۔

۳۔ عورت یعنی دی فیمیل

یہ مرحلہ ۱۹۲۰ء سے شروع ہو کر موجودہ عہد تک پھیلا ہُوا ہے۔ عورت کیا ہے؟ یہ اس دور کا اہم اور بنیادی سوال ہے۔ یہی وہ سوال تھا جو عورت کے سماجی اور انسانی حقوق کے تناظر میں اٹھایا جانا ضروری تھا۔ شوالٹر نے اسے عورت کی خود شناسی کا مرحلہ کہا ہے۔ شوالٹر نے عورت کو عورت کے طور پر جاننے پر زور دیا۔ نسوانی تنقید دراصل نسوانیت کا اگلا پڑاؤ تھا۔ پہلے مرحلے میں عورت کے حقوق کو معاشرے کے تناظر سے تلاش کیا گیا، عورت کے بنیادی تصور میں انسان کو جگہ دی گئی۔

دوسرا مرحلہ پہلے مرحلے کا حاصلِ مطالعہ بھی ہے۔ اس مرحلے میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ عورت کے مرد تناظر مطالعہ کی ضرورت ناگزیر ہے کہ ایک عورت بطور صنف اور بطور فرد مختلف کیوں ہے اور اُس کو تاریخ کے قید خانوں سے مرد حاکمیت سے کس طرح نجات دی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے یہ سمجھا جانا ضروری خیال کیا گیا کہ مردوں کی تحریروں کا مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے کہ مرد نے عورت کو اپنی تحریروں میں کس طرح پیش کیا ہے اور اگر عورت اپنی تحریروں میں مرد کو پیش کرتی ہے تو اُس کی اپنی حیثیت کیا ہوتی ہے۔

ایلین شووالٹر نے اس سوال کو Gynocriticism انتقادِ نسواں کا نام دیا ہے، اس کے بنیادی سوال کچھ یوں ہیں:

عورت کی وجودی شناخت کیا ہے؟

۱۔ عورت بطور صنف اور بطور فرد میں کیا اختصاص رکھتی ہے؟

۲۔ وہ اختصاص عورت کے وجودی اور ذاتی حوالوں کو کس طرح معرضِ بحث میں لاتا ہے؟

۳۔ عورت کا شعورِ ذات عورت کے نفسیاتی، داخلی اور حیاتیاتی معیارات اور اثرات سے کیسے تشکیل پاتا ہے؟

۴۔ عورت کی جنسی اور صنفی خوبیوں کا دائرۂ کار کیا ہے؟

۵۔ عورت کے معاشرتی اور جبلی رویے کس طرح کام کرتے ہیں؟

۶۔ عورت کے تخلیقی متون کی درجہ بندی عورت کی ذاتی اور داخلی فضا میں کیا شکل اختیار کرتی ہے؟

۷۔ مادر سری اور پدر سری حاکمیت کی تقسیم کا سماجی اور جبلی امتیاز کیا ہے؟ کیا عورت مادر سری اور پدر سری دائروں میں جبلی طور پر تقسیم ہے یا کر دی گئی ہے؟

اب ہم اگر شووالٹر کے کہے ہوئے تینوں مرحلوں کا مطالعہ کریں اور بنیادی نکات کو مد نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی شناخت ہی وہ بنیادی حوالہ نظر آئے گی جو مختلف اطراف سے اپنا اثبات چاہتی ہوئی ملتی ہے:

۱۔ عورت کی شناخت کو کیوں حاشیے پر رکھا گیا؟

۲۔ عورت کیوں تاریخ سے غائب رہی اور عورت کو صنفی تناظر سے کیوں کم تر صنف تصور کیا جاتا رہا؟

۳۔ کیا عورت کو سمجھنے یا سمجھانے کے لیے مرد تناظر ہی کافی ہے یا عورت کا سماجی کردار عورت کے تشخص کا ایک ذریعہ قرار پائے گا؟

۴۔ عورت کا حیاتیاتی اور نفسیاتی مطالعہ عورت کے بدن کے حوالے سے کیوں نہیں کیا جاتا؟

۵۔ عورت کیا ہے؟ یہ عورت سے کیوں نہیں پوچھا جاتا؟

نسوانیت، نسوانی تنقید اور انتقادِ نسواں کے یہ تمام سوالات تانیثیت کہلاتے ہیں جو نظریانے کے عمل سے گزر کر تانیثی تھیوری بنتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر، نسائی شعور کی تاریخ اردو افسانہ اور عورت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲

۲۔ ایضاً، ص ۳

۳۔ سمیون دی بوائر، ترجمہ یاسر جواد، جسمانی تاریخ، نفسیاتی اور معاشرتی مطالعہ عورت، فنکشن ہاؤس، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵

۴۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، می سوزم، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰

۵۔ ایضاً، ص ۱۷

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۷۔ ایضاً، ص ۸۳

۸۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۹۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۱۱۔ جمیل حالبی، ڈاکٹر، جمیلہ ہاشمی کے دوناول، معاصر ادب، سنگ میل پبلیکشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۷، ۱۱۶

۱۲۔ فردوس احمد بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ جلد اوّل، سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۲۰۱۹ء، ص ۵۰۴

۱۳۔ جمیلہ ہاشمی، چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، رائٹر بک کلب لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۷

۱۴۔ امیر حمزہ، بہائیوں اور بابیوں کے مہدی، نئے نبی اور ادب اعلی، الدعوۃ جلد ۴، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۱

۱۵۔ جمیلہ ہاشمی، چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، رائٹر بک کلب لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۷

۱۶۔ ایضاً، ص۲۶

۱۷۔ ایضاً، ص۲۶

۱۸۔ ایضاً، ص۳۰

۱۹۔ ایضاً، ص۳۳

۲۰۔ ایضاً، ص۳۶،۳۵

۲۱۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، ترقی اردو بورڈ کراچی، جلد چہارم، ص۹۰۸

۲۲۔ انیس ہارون ،فیمنزم اور پاکستانی عورت، فیمنزم اور ہم (ادب گواہی)، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص۳۱

۲۳۔ Britannica Concise Encyelopedia http://www .britannica. com/ feminism Retrieved on 27/11/2008

۲۴۔ انیس ہارون، فیمنزم اور پاکستانی عورت، فیمنزم اور ہم (ادب گواہی)، وعدہ کتاب گھر، کراچی ۲۰۱۳ء، ص۱۲،۱۱

۲۵۔ کشور ناہید، عورت زبان سے زبان حال تک، سنگ میل پبلیکشنز، ۲۰۱۰ء، ص۱۳

۲۶۔ سید محمد عقیل، تانیثیت۔۔ایک تھیوری، آدھی عورت۔ پورا ادب فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۱۱۳

۲۷۔ Elaine Showalter: 'Toward a Feminist Poetics. In The New Feminist Criticism. New York : Pantheon, 1985

باب دوم:

منتخب اردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں میں صنفی شناخت کی عکاسی

دونوں منتخب اردو ناولوں کا نسوانی صنفی شناخت کے جائزے کے حوالے سے تانیثیت کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تانیثیت جدید نظریات کی ایک شاخ ہے۔ اس کو مغرب میں ایک باقاعدہ تحریک کی صورت ملی اور یہ اپنے ارتقائی مراحل سے گزرتی ہوئی باقاعدہ ادب پر اثر انداز ہونے لگی۔ تانیثیت ایک ایسی تحریک ہے جو خصوصاً عورتوں کی زبوں حالی کے خلاف احتجاج بلند کیا گیا ہے۔ لفظ تانیثیت (Feminism) ایک جدید اصطلاح ہے جو لاطینی لفظ (Femina) سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ''نسوانی اوصاف'' رکھنا ہے۔ مغربی میں تانیثی ادب کی شروعات انیسویں صدی سے ہوئی۔ ان میں جارج ایلیٹ، مارگریٹ، ربیکا ویسٹ، ورجینا وولف، جین آسٹن نے فکشن کے نمونوں سے مغربی ادب میں خواتین فنکاروں کی حیثیت سے اپنا مقام منوایا۔

''فیمنزم'' کا لفظ فرانس میں پہلے پہل ۱۸۸۰ء میں مروج ہوا، جب کہ برطانیہ میں ۱۹۱۰ء میں مروج ہوا۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں ۱۸۹۴ء میں فیمنزم اور بعد میں فیمینسٹ استعمال ہوا، اس سے قبل فیمینزم کی بجائے ''ویمن رائٹس'' کی اصطلاح مستعمل یا استعمال کی جاتی تھی اس طرح یہ اصطلاح محدود سمجھی گئی۔ تانیثیت کی تعریف خاصا مشکل کام ہے لیکن اپنے وسیع تر معنوں میں یہ عورت و مرد کے کام، نظریات و خیالات کے اظہار اور ایسی تحریروں کی عکاس ہے جو خواتین کے مسائل، ان کے حقوق اور معاشرے میں ان سے روا رکھی جانے والی ناانصافی یا معاشرتی و سماجی ناہمواری پر قلم اٹھاتے ہیں یا مباحثہ کرتے ہیں۔ فیمنزم یا تانیثی شعور سے مراد مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں مردوں کے قائم کردہ تمام اقدار سے آگاہی ہے تاہم موجودہ دور میں خواتین میں اقدار پر مردوں کی غالبیت کے خلاف آواز اٹھائی ہے، یعنی عورتیں بھی اسی طرح آزاد ہیں جس طرح مرد اور یہ نیا ثقافتی رجحان خواتین

میں فلسفیانہ سطح پر تبدیلی پیدا کر رہا ہے۔ فیمینزم یا ویمن رائٹس کی اصطلاح سے قبل، جو اصطلاح مستعمل تھی، پوسٹ فیمینسٹ کہلاتی تھی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کے مطابق یہ خیال کیا جاتا ہے:

"دنیا میں مرد و عورت کا مساوی ہونا اور سماجی، معاشی اور سیاسی سطح پر تانیثیت نے مغرب میں بہت ترقی پائی، جب کہ پوری دنیا میں اس کا پھیلاؤ اور خواتین کے حقوق کی باز یافت کنت والے اداروں اور تنظیموں کی صورت میں ہوتا ہے"۔(۱)

تانیثیت آج کوئی ایک بندھی ٹکی اصطلاح نہیں بلکہ اس میں مختلف نظریات اور رجحانات شامل ہیں۔ یہ تانیثی تحریک آج کے معاشرے میں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور دیگر معاملات میں بھی مردوں کے مساوی حقوق کی دعویدار ہے تانیثی تنقید سے مراد، ادب کے حوالے سے حقوق نسواں کے نظریے پر مبنی تنقید کو کہا جاتا ہے۔ میر یلین نے اپنے مضمون، عورت کے خلاف جنگ پر محاذ پر، فیمینزم (Feminism) کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"زنانہ پسِ منظر میں خواتین کے اتحاد کے ذریعے کسی بھی گروپ کی عورتوں کے حالات بہتر بنانے کا نام تحریکِ نسواں یا فیمینزم ہے، اگر عورتوں کے خلاف صف آرا طاقتوں کو بہتر بنانے میں ہونے والے کام کو دیکھا جائے، تو یقیناً اسے انتہائی کامیابی قرار دیا جائے گا۔"(۲)

ضمیر علی بدایونی نسائی شعور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نسائی شعور دراصل مابعد جدید پوسٹ ماڈرن رویوں کی آگاہی کا نام ہے جو ہماری فکر کا مکمل حصّہ نہیں بن سکا، کیوں کہ ہماری قدریں روایتی طور پر مردوں کی فکر کے تابع رہی ہیں، ان میں عورت کا حصّہ نہ ہونے کے برابر ہے، اب صورت حال یہ ہے کہ وعورتیں مرد کی حاکمیت اور ان کے تابع رسم و رواج دے آزاد ہو کر اپنے آپ کو

اس آئینے میں دیکھ رہی ہیں جو ان کا اور ان سے متعلق معاشرے کا سچا اور اصل روپ اسامنے لا سکے۔"(۳)

ڈاکٹر وزیر آغا کا اس تحریک کے بارے میں کہنا ہے:

"دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تحریک نے مختلف شعبوں میں بہ یک وقت اپنی قوت کا اظہار کیا، یعنی سماجی، سیاسی، علمی، ادبی اور دیگر سطحیں اس سے مستفیض ہوئیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر تعلیم کا حصول سب سے بڑا محرک تھا۔ تعلیم سے مراد صرف تعلیم نسواں نہیں، مردوں میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان بھی ہے، جو بیسوں صدی میں عام ہوا، حتیٰ کہ اس نے تعلیم بالغاں کو بھی اہمیت بخشی۔ تعلیم کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک وہ جو لکھنے پڑھنے کے عمل تک محدود ہے، دوسرا وہ جو معلومات کے حصول پر منتج ہوتا ہے، اور الیکٹرک میڈیا کے ذریعے ان لوگوں تک بھی پہنچتا ہے، جو لکھنے پڑھنے کی سعادت سے محروم ہوتے ہیں۔خواتین نے اس سے بالخصوص فائدہ اٹھایا۔"(۴)

کشور ناہید کے بقول:

اس رائے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ فیمینزم کا بنیادی نکتہ، معاشرے میں عورت کے درست مقام کا تعین کرنا ہے۔ تانیثیت کی تحریک کی ابتدا ایک سماجی تحریک کے طور پر ہوئی یہ معاشرے کے جبر کے برعکس پیدا ہوئی جس کی مانگ تھی کہ عورت کو سماج میں مرد کے برابر درجہ دیا جائے معاشرے میں عورت و مرد کے حقوق یکساں ہونے چاہیے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں عورت کے جذبات و احساسات کو مجروح کیا گیا۔ ادب ہو یا زندگی کا کوئی بھی پہلو، عورت کو مرد سے کمتر جانا گیا تانیثیت کے تحت عورت کے ذاتی تشخص کو بحال کرتے ہوئے اسے عزت و وقار فراہم کرنا ہے۔

فیمنزم کی تحریک کا بنیادی مقصد عورتوں کے مسائل پر قابو پانا ہے جس میں تعلیم بچوں کی نگہداشت، گھریلو تشدد، جنسی مسائل، ملازمت کے حقوق، ابارشن، ریپ، قتل، اغواہ، کاروکاری، وٹے سٹے، ونی کی رسم، قرآن سے شادی، طلاق و خلع، بچوں کو چھین لیا جانا، وغیرہ جیسے مسائل کا فوری حل اور اس کے لیے قانون سازی کی جائے۔

ڈاکٹر زاہد محمود گھریلو تشدد کی نوعیت کی وضاحت کرتے ہیں:

> ''گھریلو تشدد اس طرز عمل کو کہتے ہیں، جو مسلسل کسی شخص کے خلاف اس لیے روا رکھا جائے کے اس کی حرکات و سکنات اور قوت ارادی کو قابو میں لایا جا سکے جسمانی، ذہنی اور جنسی تشدد اسی طرز عمل کی مثالیں ہیں۔ گھریلو تشدد کے حربوں میں چیخنا چلانا، گالیا ں دینا، دھکے دینا، مار پیٹ کرنا، تھپڑ مارنا، گلا گھونٹنا، ٹھوکریں مارنا، کاٹنا، کسی ہتھیار سے مارنا، ڈرانا دھمکانا اور ہراساں کرنا، جان لینے کی دھمکی دینا، کسی کے جذبات و احساسات کو مجروح کرنا، کسی کے ماں باپ ے ابزرگوں کی بے عزتی کرنا، کسی کو نیچا دیکھانا، کسی کو سرعام بے عزت کرنا، کسی کو دوسرے کے سامنے بے ذلیل کرنا، جنسی تشدد جبر و اکراہ، زورزبردستی سے کام لینا، جنسی حملہ اور زنا بالجبر کا ارتکاب شامل ہے''۔(۵)

شادی کے بعد بہو کا جہیز کم لانا اور اس پر ساس بہو اور نندوں کے جھگڑے، خواتین اور بچیوں پر تیزاب پھینکے جانے جیسے مکروہ افعال، غربت و بیرزگاری کے نتیجے میں چولہا پھٹنے کے واقعات میں عملی اقدمات کیے گئے ہیں۔ مثلاً برن کیسیسز میں ڈیتھ سٹیمینٹ کے قانون میں تبدیلی لائی گئی ہے۔ پہلے قانون کے مطابق مذروبا کا نزاعی بیان ہسپتال میں پولیس اور ڈاکٹروں کی موجودگی میں قلم بند کیا جاتا تھا اور اسی کی بنیاد پر ایف آئی آر درج کی جاتی تھی عموماً مظلومین کا تقریباً بیس فیصد جل جاتا ہے پھر ہسپتال میں رسائی ہوتی ہے یا عموماً قریب المرگ ہونے کی وجہ سے نزاعی بیان نہ دیے جانے پر سسرال والے

خود کشی ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، لہذا طے یہ پایا کہ جائے واردات پر ہی اگر خاتون کوئی بیان دیتی ہے تو اسے حرف آخر سمجھا جائے گا ایک محتاط اندازے کے مطابق تشدد خواہ وہ کسی بھی قسم کا ہو اس کے نتیجے میں وبائی امراض کی بہ نسبت عورتوں کی شرح اموات زیادہ ہوتی ہے۔ کشور ناہید کے خیال میں:

تقریباً اٹھارویں صدی کے آخر میں مغرب کی خواتین میں یہ شعور اجاگر ہوا کہ مرد کی بالا دستی کے اس معاشرے میں ان کے بھی حقوق ہیں اور ان کی بھی ایک پہچان ہے مرد کی حاکمیت کے لیے پدر سری (باپ کی حکومت) کی اصطلاح وضع کی گئی۔ ہمارا معاشرہ پدر سری معاشرہ ہے جہاں مرد، عورت کا استحصال کسی نہ کسی صورت میں کر رہا ہے۔

ایک عرصے تک عورت کے ذہنی شعور، حقوق اور تخلیقی صلاحیتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اسے ایک مخصوص دائرہ کار میں قید کیا جاتا رہا اور کئی سطحوں پر آج بھی یہ استحصال جاری ہے۔ تانیثی تنقید کے حوالے سے اٹھائی جانے والی سب سے پہلی آواز، ورجینا وولف، کی آواز کو قرار دیا جاتا ہے "منتخب ادبی اصطلاحات" میں اس ضمن میں کچھ یوں درج ہے:

> "ادب کے ضمن میں انگریزی ناول نگار، ورجینا وولف، کا کردار قابلِ ذکر ہے جس نے سنجیدگی سے یہ سوال اٹھایا کے شاعروں اور فکشن لکھنے والوں کی صفوں میں عورتیں اتنی کم کیوں ہیں، یا عورتوں کے لیے شعر کہنا یا فکشن لکھنا اتنا مشکل یا بعض حالات میں ناممکن کیوں ہے؟" (۶)

مغرب میں تانیثیت کے حوالے سے ورجینا وولف کا کردار قابلِ ستائش ہے اور اردو میں کشور ناہید نے اس آواز کو بلند کیا کہ ادب میں عورت کی قدر اور اہمیت کو متعین کیا جائے۔ وہ کیا لکھتی ہے؟ کیا سوچتی ہے؟ اور زندگی سے متعلق اس کے خیالات و احساسات کیا ہیں؟....

تانیثیت میں درج ذیل پہلوں کو بنیادی اہمیت دی گئی:

ا۔ معاشرے میں عورت کے درست مقام کا تعین کرنا۔

۲۔ ان رویوں کے خلاف احتجاج، جن سے عورت کی حق تلفی ہو۔

۳۔ عورت کو ادبی اظہار کی مکمل آزادی اور مواقع دیے جائیں۔

۴۔ جن مرد نقادوں نے خواتین کے مشاہدات و تجربات کو موضوع بحث بنایا وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے یا نہیں اور پھر کس حد تک کامیاب ہوئے۔

۵۔ عورت کیا سوچتی ہے، معاشرے کو کس زاویے سے دیکھتی ہے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کے تشخص کو اجاگر کیا جائے۔

اس کے علاوہ اس بات کا بھی جائزہ لینا کہ ادب میں عورت کا کردار کیا ہے۔

مرد کے ذہن میں عورت کی حسیات کے متعلق جو خود ساختہ (Images) موجود ہیں ان کا جائزہ لے کر نفی کی جائے۔

شمس الرحمان فاروقی، اس بات کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> "مردوں کے بنائے ہوئے متن کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ ان عورتوں کے بارے میں کیا تصورات اور اصول، شعوری طور پر پیش کئے گئے ہیں۔"(۷)

درج بالا تمام نکات تانیثی تنقید کے بنیادی موضوعات ہیں تانیثی تنقید و ادب میں ان رویوں کے ساتھ بحث ہے جن سے عورت کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ہمارے کلچر میں عورت کی شخصیت اور اس کی ذات کھل کر سامنے نہیں آتی۔ کیونکہ اسے ہمیشہ کمزور ہستی خیال کرتے ہوئے مرد کا دستِ نگر بنایا گیا۔ ازل سے عورت اور مرد کی ذات کی تقسیم ہے۔ دونوں اپنی صنف، ڈھانچے، بناوٹ اور فکر و سوچ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی تقسیم کے بارے میں کلیم احسان اپنی کتاب "تفہیم و تحسین" میں رقمطراز ہیں:

> "ہماری معاشرتی زندگی میں مرد اور عورت کی تقسیم اتنی مستحکم اور مستقل ہے کہ مادی و جسمانی سطح سے لے کر باطنی و ذہنی سطح تک یہ مختلف منطقوں کی مخلوق نظر آتے ہیں.... یہ تقسیم زندگی کے ہر

شعبے کی طرح ادب میں بھی نمایاں ہے۔شاعرات کی ایک معقول
تعداد مختلف رسائل و جرائد میں بڑی کثرت سے چھپ رہی ہے۔
شاعرات کی شاعری پڑھتے ہوئے سہاگن، سوتن، بیاہ داج،
گھونگھٹ، کجرا، گجرا، لالی، ہار، ڈنڈیاں، چوڑا، جوڑا، ہنڈیا، سسرال،
میکہ، چنری، کوکھ وغیرہ جیسے الفاظ آپ کو مل جائیں گے۔"(۸)

عورت ایک ایساموضوع ہے جو حد درجہ اہمیت کا حامل ہے عورت کو ہمیشہ محرومی کا شکار ہونا پڑتا ہے گھر کی چار دیواری سے لے کر باہر کی کھلی فضا تک عورت مشکلات سے دوچار ہوتی رہی ہے گھر اور سماج کا ایک اہم رکن ہوتے ہوئے بھی عورت کو مظلومی، محکومی، ظلم و تشدد کا شکار ہو کر ساری زندگی مصائب میں ہی گزارنی پڑی یہ صرف ایک ملک کی یا کسی ایک خطے کی بات نہیں ہے، بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ پوری دنیا میں اسے اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔اس کی مصیبتوں کی ایک طویل داستان رہی ہے اس پر آوازیں تو بہت اٹھائی گئیں لیکن آج تک کوئی ایسا حل نہیں نکلا کہ جس سے عورت کے صدیوں پرانے زخم پر مرہم لگ سکے۔

آزادی نسواں کی تحریک بھی ایک فریب ہے جس کی وجہ سے خواتین کو بہت سی مشکلات کا سامنا ہے۔ جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی عورت کی اس آزادی سے متفق نہیں ہیں۔ان کے نزدیک عورت آزادی نہیں بلکہ ایک جدید غلامی میں مبتلا ہو گئی ہے۔فرماتے ہیں:

"عورتوں کو جس بے دردی کے ساتھ سڑکوں اور بازاروں میں
گھسیٹ کر لایا گیا ہے وہ "آزادی نسواں" کے فراڈ کا المناک پہلو
ہے۔ آج یورپ اور امریکہ میں جا کر دیکھئے تو دنیا بھر کے تمام نچلے
درجے کے کام عورت کے سپرد ہیں۔ریستورانوں میں کوئی مرد شاذ
و نادر ہی کہیں نظر آئے گا، ورنہ یہ خدمات تمام تر عورتیں انجام
دے رہی ہیں، ہوٹلوں میں مسافروں کے کمرے صاف کرنے، ان
کے بستر کی چادریں بدلنے اور "روم اٹنڈنٹ" کی خدمت تمام

عورتوں کے سپرد ہیں۔ دوکانوں پر مال بیچنے کے لیے مرد خال خال نظر آئیں گے یہ کام بھی عورتوں ہی سے لیا جا رہا ہے۔ دفاتر کے استقبالیوں پر عام طور پر عورتیں ہی تعینات ہیں اور بیرے سے لے کر کلرک تک تمام "مناصب" زیادہ تر اسی صنف نازک کے حصے میں آئے ہیں جسے "گھر کی قید سے آزادی" عطا کی گئی ہے۔"(۹)

تانیثیت کی ماہیت ونوعیت

کائنات دو طرح کے انسانوں سے مزّین ہے ایک مرد اور دوسری عورت۔ زندگی کی اساس عورت و مرد کے ساتھ وابستہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں تو پھر دونوں میں تفاوت اور بُعد کیوں پایا جاتا ہے؟ مرد کو حاکم کُل، مختار کُل سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ عورت ناقص العقل اور ناتواں گردانی جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں مردوں کے غیر معتدل، انتہا پسندانہ اور غاصبانہ رویے سے عائلی زندگی زہرناکیوں کا کیوں شکار ہوتی ہے؟ دراصل ہمیں معتدل رویوں سے تہی جس قدر انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے، اس کا بڑا سبب مناسب ترتیب کا نہ ہونا ہے، اس کے بہت سے محرکات ہیں، جن میں تہذیبی و ثقافتی، مذہبی و اخلاقی اور نفسیاتی و احساساتی سطح پر ہونے والی آفاقی ناانصافی اور غیر مساویانہ سلوک ہے، جو عموماً مرد و عورت کے مابین روا رکھا جاتا ہے۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ مرد میں منفی خصائص کو پروان چڑھانے والی بھی عورت ہی ہے۔ مرد کی حاکمیت یا پدر سری معاشرے کی حامل ماں اپنی زندگی کے تلخ تجربات کی روشنی میں بیٹیوں سے ناروا سلوک کرتی ہے اور مرد کی حاکمیت اور بے جا دھونس برداشت کرنے کے نتیجے میں بیٹے کو مضبوطی کی علامت سمجھتے ہوئے لڑکے کی نشوونما اس انداز سے کرتی ہے کہ بالآخر اس کی زہرناکی کا شکار کسی اور کی آغوش میں پلنے والی بیٹی بنتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے مردوں کی تعداد نسبتاً کم ہے، جن کی شخصیت میں استحکام اور اعتدال پایا جاتا ہے، جو عورت کی عزتِ نفس مجروح کرنے یا اپنی محرومیوں اور نااہلیوں کے عتاب کا نشانہ بنانے کے بجائے اسے اپنی زندگی کا حقیقی ساتھی تصور کرتے ہیں اور اُس کی ذہنی، جذباتی اور احساساتی کیفیات کے بارے میں ایسے محتاط ہوتے ہیں، جیسے اپنے احساسات کے بارے میں۔ لہٰذا مرد عورت کے مابین پائے جانے والے

فطری امتیازات کو باہمی افہام و تفہیم سے کم کیا جاسکتا ہے، عموماً روز مرہ خانگی زندگی میں پائے جانے والے ذہنی بُعد کا ایک سبب یہ ہے کہ مرد حضرات مسئلوں کے حل کے لیے جلد بازی سے کام لینا پسند کرتے ہیں اور اپنی رائے اور فیصلے کو اٹل سمجھتے ہوئے مسلط کرنا شروع کر دیتے ہیں، جب کہ عورت اپنی پریشانیاں بانٹنا پسند کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ مشکل حالات میں اُن کی دلجوئی کی جائے، اُن کے نزدیک یہ مسائل و مشکلات کو کم کرنے کا سبب بنتی ہے۔ جان گرے کی رائے ہے کہ جب مرد و عورت ایک دوسرے کی مختلف طبیعت کو سمجھنے کو لائق ہو جاتے ہیں، تو اُن کی محبت ایک پھول کی مانند کھل جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان سے ایک خوشحال زندگی کی تمنا کی جاسکتی ہے اور زندگی کے مسائل کا حل نکالا جاسکتا ہے۔ کشور ناہید کے مطابق:

> ”مفاہمت اور خانگی تقاضوں کی تاریخ اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہی محبت جو ایک لمحے پہلے رس تھی، سم بن کر آپ کو کچوکے دینے لگتی ہے۔ محبت کو دوستی میں بدلنا، ہمارے معاشرے کے مردوں کو تو بالکل ہی نہیں آتا، اس لیے عورت اور مرد کے رشتے میں ٹھہراو نہیں آتا۔ معاونت کی کوئی شبہیہ نہیں نظر آتی .... بہت کم کم ہے کہ احساس شائستگی اور افتخار عورت، مرد کے رشتے میں جھلکتا ہو۔“(۱۰)

اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ قدرتِ حق نے مرد و عورت کو ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے جو ازدواجی بندھن میں بندھ کر ایک خوبصورت رشتے کو نبھاتے ہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ بہ حیثیت انسان دونوں برابر ہیں۔ ”صدائے کن فیکون“ تخلیق، کائنات کا مظہر ہے۔ ظہور آدم و حوّا کائنات کی تعمیر و تشکیل کا سبب بنا۔ دُنیا کے تقریباً تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ حوّا کی ایما پر آدم نے دانہ گندم چکھا، جس کی پاداش میں جنت سے نکال دیے گئے تب سے آج تک یہ نظریہ مشہور ہے کہ عورت، چوں کہ آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی، اس کے لیے ناقص العقل، کمزور و کمتر ہے۔ دوسرا یہ کہ بنی آدم کو ورغلانے والی ہے، اس طرح جب آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل (جن کے ناموں کا ذکر قرآن پاک میں نہیں بلکہ، ابنی آدمؑ، کہہ کر ضمنی طور پر یہ قصّہ بیان کیا گیا ہے، جب کہ تورات میں قصّہ

ناموں کے ساتھ موجود ہے)"حفیظ الرحمن سیوہاروی، مولانا محمد، قصص القرآن جلد اول و دوم، لاہور: مکتبہ رحمانیہ، س ن، ص ۵۴۔ دونوں اقلیما پر عاشق تھے۔ ہابیل کے ہاتھوں قابیل مارا گیا یہیں سے طے پایا کہ عورت کا وجود فتنہ فساد کی علامت ہے سعد اللہ برق کے خیال میں مرد کی حاکمیت کے تصور کی جڑیں بھی اسی واقعے سے منسلک ہیں:

> "قابیل کے انجام کے بارے میں کوئی واضح بیان موجود نہیں ہے، لیکن تورات میں اس کی اولاد کا تذکرہ آیا ہے۔ اب یہ بھی واضح نہیں ہے کہ ہابیل کو مارنے کے بعد اس کی شادی یونداسے ہوئی یا اقلیما سے ہوئی، لیکن کم از کم یہ بات طے ہے کہ مرد کی یہ ذات شریف ابتدا ہی سے عورت کو انسان کی بجائے ملکیت سمجھتی آرہی ہے، اس کہانی میں بے چاری یوندا اور اقلیما کی نہ مرضی پوچھی گئی نہ انسان سمجھا گیا اور یہی روایت آج تک قائم ہے کہ عورت کی زندگی کا فیصلہ مرد کے ہاتھوں میں ہے، اور عورت کو ایک خاموش جانور کی طرح جس طرف مرد کا جی چاہے ہنکا دیا جاتا ہے یا یوں کہیے مرد نے یہ بتایا ہے کہ عورت کو ابتدائے آفرینش سے کیا سمجھا جارہا ہے۔"(۱۱)

مندرجہ بالا واقعات کے درپردہ بھی یہی عوامل کارفرما ہیں، چوں کہ اللہ تعالیٰ نے کرۂ ارض پر انسانوں کو آباد کرنا تھا، اس لیے آدمؑ سے دانستہ غلطی فطری امر ثابت ہوئی، ورغلایا جانا اس بات کی علامت ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدہ بُھلا بیٹھا اور وہ خطا کا پُتلا ہے، یہ بہکاوا ایک عورت کا بہکاوا نہیں، بلکہ شیطان کا بہکاوا تھا، جس نے محض حوّا کو ہی نہیں، بلکہ آدمؑ کو بھی ورغلایا تھا۔ ان مباحث کو بیان کرنے کا مقصد ان حقائق کو دریافت کرنا ہے، جن کی پرداخت سے عورت کے حوالے سے تعصّبات کا درخت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھنا ہوتا گیا اور تکمیل آدمؑ کی خاطر تخلیق کی جانے والی مخلوق پر ازل سے ہی 'کج سرشتی' کی مہر لگادی۔ ایم عبدالرحمن خان کا اس حوالے سے کہنا ہے:

"جس مشہور حدیث کی رو سے حضرت حوّا کا حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے، اس میں ذکر نہ حضرت آدمؑ کا ہے اور نہ حضرت حوّا کا، بلکہ محض عورت کی پیدائش اور کج سرشتی کا بیان ہے۔ آثار میں بھی جو روایت ملتی ہے، وہ توریت کی آواز کی بازگشت ہے اور توریت کا بیان حسب ذیل ہے.... خداوند نے آدمؑ پر بھاری نیند بھیج دی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے، جو اس نے آدمؑ سے نکالی تھی، ایک صورت بنا کر آدمؑ کے پاس بھیجا۔"(۱۲)

دیگر الہامی کتابوں میں عورت کو کمزور اور کم تر درجے کی مخلوق ثابت کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے ایک مخلوق کی بجائے ایک انسان کی حیثیت سے قبول کریں جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (ترجمہ) اور انسان کو کمزور ہی پیدا کیا گیا۔ اس ارشاد ربانی میں عورت کا اس طرح مذکورہ نہیں، جس بنا پر عورت کی کمزوری، کمتری اور کم عقلی کو مسلمات میں سمجھ لیا گیا ہے۔ انسان کا لفظ مرد و عورت دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ دونوں کو جسمانی اور ارادی طور پر کمزور پیدا کیا گیا۔ کسی کو بھی دوسرے پر برتری نہیں۔ مرد و عورت گاڑی کے دو پہیے ہیں، یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ (اللہ) انسانیت کی گاڑی کا ایک پہیہ تو مضبوط اور طاقتور بناتا اور دوسرا کمزور اور ناتواں۔(۱۳)

دیگر الہامی کتب میں عورت کو خدائی عتاب اور غضب کا محور مرکز قرار دینے کے لیے دردزہ اور مرد کی باندی ہونے کی سزا کو ڈھال بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک کے بقول:

"گویا نہ صرف یہ کہ آدمؑ کے جنت سے نکلنے کا سبب عورت کو بتایا جا رہا ہے بلکہ حمل اور اولاد کی پیدائش کی تکالیف کو عورت کی سزا بتایا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ ان بیانات سے عورت کی وقار اور مرتبے میں اضافہ تو ہوتا نہیں، دوسری طرف اگر اس حوالے سے قرآن کا

مطالعہ کیا جائے، تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام ان تکالیف کو عورت کی
عظمت اور وقار میں اضافے کا سبب بتاتا ہے۔" (۱۴)

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم مختلف تہذیبوں، معاشروں میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کا جائزہ لیں، تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ موجودہ حالات میں عورت کو درپیش مسائل خود ساختہ ہیں یا ان معاشروں کی دین ہیں۔ مزید برآں اُن اوہام کا پتہ لگانا بھی ضروری ہے، جو مرد کی حاکمیت والے معاشرے کی صدیوں کی ریاضتوں کا نتیجہ ہے۔ کشور ناہید کے خیال میں آدمؑ کو جنت سے نکالے جانے کی ذمہ دار عورت کو قرار نہیں دیا جاسکتا، کیوں قرآنی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ محض عورت ہی خطاکار نہ تھی، بلکہ دونوں ہی قصوروار تھے۔ روحانی معاملات میں عورت و مرد کو قرآن کی رو سے مساوی حقوق حاصل ہیں، اس حوالے سے کشور ناہید کا کہنا ہے:

"حیاتیاتی سطح پر مرد و عورت یقیناً مختلف ہیں، لیکن اس تضاد کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں کی اہمیت یکساں نہیں، اللہ کے نزدیک مرد و عورت زندگی کی بھاگ دوڑ میں ایک جیسے حصّے دار ہیں قرآن کی بہت سی آیات، مثلاً (۹۷:۱۶، ۱۹۵:۳، ۱۲۴:۴، ۱۷:۹) میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کو مخاطب کیا ہے اور ان کے حقوق، فرائض ایک جیسے متعین کر دیے ہیں اسی طرح جزا و سزا کے معاملات میں بھی دونوں برابر ہیں۔" (۱۵)

تہذیبی سطح پر عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے حوالے سے ڈاکٹر ذاکر نائیک کا کہنا ہے:

"قدیم تہذیبوں میں عورت کی حیثیت نہایت بے وقعت تھی اور اسے محض شہوانی جذبات کی تسکین کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ اسے بنیادی شرف و عزت سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔" (۱۶)

پدرسری معاشرے کی ابتدا مشرق وسطیٰ میں ہوئی۔ قدیم معاشروں میں عورتوں کو بڑے اختیارات حاصل تھے، اس حوالے سے پرویز اختر کا کہنا ہے:

"ساتویں اور چھٹی صدی ق م میں یونان کو دوسرے علاقوں میں عورت کی حالت بہت حد تک خستہ تھی اور معاشرے میں مردوں کی برابری کا تصّور بھی نہیں کر سکتی تھیں ، انھیں نہایت سخت ضابطوں اور قواعد کی پابندی پر مجبور کیا جاتا تھا، لیکن جزیرہ لسبوس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہاں عورتیں عوامی جلسوں میں بغیر کسی روک ٹوک کے شریک ہوتیں اور معاشرتی امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ ادب، موسیقی اور شاعری میں بھی اُن کی دلچسپی مردوں سے ہرگز کم نہ تھی ۔ شعر و سخن اور رقص و موسیقی کی محفلیں جمتیں تو مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی آموجود ہوتیں۔ قدیم دنیا کی تاریخ میں آزادیٔ نسواں کی ایسی مثال کسی دوسرے خطے میں نہیں ملتی۔" (۱۷)

ابن حنیف کا کہنا ہے:

"مندروں کی پجارنوں کے بعض مخصوص طبقوں کی خواتین اننا اور اُشتار دیوی سے سچی عقیدیت، ایثار، خلوص اور قربانی کے جذبے میں ڈوب کر ان کی خدمت کے نام پر اپنا کنوارپن تک تج دیتی تھیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ سومیری اور بابلی ان کے اس فعل کو دیوی کی نسبت سے مقدس، جائز، روا اور عین مذہب خیال کرتے تھے۔" (۱۸)

اس طرح بابلی تہذیب کے حوالے سے ڈاکٹر ذاکر نائیک کا خیال ہے:

"اس تہذیب میں عورتوں کو گھٹیا سمجھا جاتا تھا اور بابلی قوانین کے تحت وہ تمام حقوق سے محروم تھیں، اگر ایک آدمی قتل کا مرتکب ہوتا تو بجائے اس کے کہ اسی کو سزا ملے اس کی بیوی کو بھی موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا۔"(۱۹)

اپنی تمام تر قربانیوں کے باوجود آخر کیوں عورت تاریخ کے پردے سے غائب ہو کر گمنامی کے گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ گئی ہے؟ یا کہ وہ کوئی بڑا کارنامہ کیوں انجام نہ دے سکی؟ ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے:

"تحریری تاریخ کے وجود میں آتے آتے انسانی معاشرے پر مرد کا غلبہ ہو چکا تھا اور عورت کی سماجی حیثیت گر چکی تھی اور عورت معاشرے میں مرد کے مساوی نہیں رہی تھی اور اس غیر مساوی درجہ بندی سے مرد کے لیے مردوں کی تاریخ میں عورت جس حیثیت اور شکل میں ظاہر ہوتی ہے، اس میں کوئی عظمت، عزت ووقار نہیں، بلکہ اس سے ایک ایسا تاثر ابھرتا ہے کہ جس میں عورت کو کبھی اسے بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور اس کی قربانی کا کوئی ذکر تک نہیں ہوتا کہ جو مرد اپنے مفادات کے لیے اس کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔"(۲۰)

ڈاکٹر مبارک علی نے "تاریخ اور عورت" میں عورت سے روا رکھے جانے والے سلوک کو تفصیلاً بیان کیا ہے، اس کے چیدہ چیدہ نکات مندرجہ ذیل ہیں:

☆ مرد نے عورت کو بے جا حاکمیت کے نشے میں اپنی ملکیت و جائیداد سمجھتے ہوئے، تخت و تاج بچانے کی خاطر بطور تاوان قربان کیا۔

☆ دیوتاؤں کی خوشنودی کے حصول اور مختلف آفات کے خاتمے کے لیے بھی بھینٹ چڑھایا گیا۔

☆ اپنی مردانگی اور فتح کو ثابت کرنے کے لیے عورت کی عصمت دری مرد کی اجتماعی اور انفرادی نفسیات بن گئی، یہی وجہ ہے کہ عورت کی حیثیت مالِ پانسے کی ہونے لگی۔

☆ پوری تاریخ میں اگر جنگ مرد کی علامت ہے تو امن پسندی کو عورت سے منسوب کیا جاتا تھا۔

☆ عورت کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھا جاتا تھا اور اس حیثیت سے ملک و قوم اور تہذیب کے زوال کی وجہ اور برائیوں کا سبب قرار دیا جاتا تھا۔ حکمرانوں اور اشراف کی تباہی کی وجہ بھی عورت اور شراب کو کہا گیا ہے۔ عورتوں کی مجلس اور صحبت میں رہنے کی وہ سے حکمرانوں کی مردانہ صفات ختم ہو کر ان کی جگہ نسوانی عادتیں درآئی تھیں، اس لیے محض مردوں کی جنسی خواہشات کی تسکین کا سامان بننے سے عورت کا مقام مزید گھٹ گیا۔

☆ پرانے دستور میں عورت قانوناً شادی کے بعد شوہر کی نگرانی میں آجاتی تھی، جیسا کہ شادی سے پہلے باپ کی نگرانی میں تھی۔(۲۱)

رابعہ خضداری ناول "می سوزم" میں مرکزی کردار کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ آپ خضدار اور بلخ کے امیر کعب (جو رحمدل اور نیک امیر ہیں) کی بیٹی اور حارث کی بہن ہیں۔ آپ کو باپ کی طرف سے "ذین العرب" کا خطاب ملا۔ نہایت ہی رحمدل، نیک اور متقی خاتون ہیں۔ صاحبِ علم ہیں اور ریاستی معاملات میں سمجھ بوجھ رکھتی ہیں۔

مولوی فضل الحسن جو امیر کعب کے دونوں بچوں (رابعہ اور حارث) کے اتالیق ہیں رابعہ کے متعلق پیش گوئی کرتے ہوئے امیر کعب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

> "مجھے رابعہ بنت کعب میں غیر معمولی صلاحیتں نظر آتی ہیں جو کسی بھی ریاست کی باگ دوڑ سنبھالنے کی متحمل ہو سکتی ہیں"۔(۲۲)

یہ سن کر مجلس میں شامل دانش مند ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ رابعہ صنف کے لحاظ سے عورت ہے جو ریاستی باگ دوڑ کے لیے قابل قبول ثابت ہونے کے خدشے کے باعث قابل توجہ ہیں البتہ امیر کعب کا مولوی فضل الحسن کی بات کی تائید ایک باپ کا اپنی بیٹی پر اعتماد ظاہر کرتا ہے۔

قاضی احمد سنان ان کی فنی مصوری کی تعریف کرتے ہیں اور سپہ سالار عزیز بن ثابت (جو رابعہ خضداری کی فن سپہ گری کے لیے موقوف ہے) وہ رابعہ خضداری کی دلیری اور شجاعت کی تعریف کرتے ہیں۔

دانش مندوں کے اجلاس میں رابعہ خضداری کے علم، بہادری، شاعری، فن مصوری، آزادی، عبادت گزاری کی تائید و تعریف ہوتی ہے۔ اسی اجلاس میں امیر کعب ان کو "ذین العرب" کا خطاب دیتے ہیں۔ حارث کا کردار رابعہ خضداری کے صنفی تضاد پر جگہ جگہ ضرب لگاتا ہے۔ یہ بات مسلمہ حقیقت ہے کہ بیٹیوں کی محبت اپنے والد سے بیٹوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ ناول میں رابعہ خضداری اپنے والد سے گویا یوں مخاطب ہوتی ہے :

> "والد محترم ! آج آپ کچھ معمول سے زیادہ کمزور دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ریاست کے بارے میں متفکر ہیں جبکہ ہمیں آپ کی فکر بڑھ رہی ہے"۔(۲۳)

رابعہ خضداری کا شاعرانہ رویہ گل رعنا کی زبانی کچھ یوں ہے۔ گل رعنا رابعہ شہزادی کی قریبی ساتھی اور ہم راز ہیں جو آخر تک رابعہ شہزادی کی وفادار ہے۔

رابعہ خضداری کی صنفی شناخت:

بطور عورت رابعہ خضداری عاشق کے رول میں بھی نظر آتی ہیں جیسے ایک غلام اور ان کی فوج کے سپہ سالار بیکتاش سے عشق ہو جاتا ہے۔ رابعہ خضداری کے لیے ذات پات وغیرہ اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ بیکتاش کی محبت میں اپنے بھائی حارث کے سامنے بھی ڈٹ کر کھڑی نظر آتی ہے۔ بیکتاش کی جان خطرے میں ہوتی ہے تو شہزادی اپنے فن سپاہ گری سے سپاہیوں کو شکست دیتی ہے اور بیکتاش کی جان بچا کر وہاں سے لے جاتی ہے۔ جس پر بیکتاش کو حیرت بھی ہوتی ہے کہ شہزادی اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچانے کے لیے آئی ہے۔ رابعہ خضداری دیگر علوم کے ساتھ ساتھ انسانیت کا درد بھی رکھتی تھی۔ رابعہ نے اپنی شاعری اور

دانشمندی کی وجہ سے بہت شہرت پائی۔ دانشمندوں کی محفلوں میں بھی رابعہ کی تعریفیں کی جاتی تھیں۔ ریاست کے معاملات میں بھی رابعہ نہایت رازداری سے نظر رکھتی تھی اور مسائل کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی نظر آتی تھی جو کہ اس معاشرے کی عورت کے لیے قطعی درست نہیں سمجھا جاتا تھا۔

بطور بیٹی رابعہ خضداری نے باپ امیر کعب کی زندگی میں بھی والد کے احکامات کا خیال کیا اور مرنے کے بعد بھی بھائی جو کہ اقتدار کے نشے میں دھت تھا، اس کو والد کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایات دیتی رہی مگر وہ بعض نہ آیا۔ اس نے ہر طرف لوٹ مار مچار کھی تھی جو کہ رابعہ خضداری سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ تب بھی رابعہ نے بیکتاش جو کہ جنگجو تھا اسے ریاست کے معاملات کی خبر رکھنے کا حکم دیا اور بیکتاش نے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے تمام راز رابعہ کے سامنے رکھ دیے۔ دیکھا جائے تو رابعہ نے بطور بیٹی، بہن، عاشق اور بطور معاشرے کی فرد کے بلاخوف وخطر تمام فرائض بخوبی انجام دیے۔

رابعہ خضداری بہت سے علوم میں مہارت رکھتی تھی۔ امیر مقام نے اپنی بیٹی کی تعلم و تربیت اور پرورش میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ رابعہ اپنی تہذیب جس میں عرب اور بلوچستان کی تہذیبیں بھی شامل ہیں ان سے متعلق مکمل آگاہی رکھتی تھی۔ یہ ایک رحم دل اور نیک خاتون تھی۔ شاعری میں بھی رابعہ خضداری نے بہت شہرت حاصل کی۔ دانشمندوں کی محفلوں میں بھی رابعہ کی تعریفیں کی جاتی تھیں۔ ایک دفعہ امام خاتون سے کھانے میں کچھ کمی رہ گئی تو حارث نے سب کے سامنے تذلیل کی۔ ایسے میں رابعہ نے یہ محسوس کیا کہ وہ اگر خاموش ہے تو وہ بھی اس گناہ میں شامل ہے کہ عمر رسیدہ خاتون کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے رابعہ کی ذات میں رحم دلی ظاہر ہوتی ہے۔ رابعہ خدا کے بندوں سے محبت کو ترجیح دیتی ہے اور اسی میں فلاح سمجھتی ہے۔

خاتون شاہ بانو ناول میں ایک ادبی کردار ہے۔ ایک دن باغ بہشت میں شام کو محل کے اندر شاعری کی محفل کا انتظام کرتی ہے۔ رات کو چمن اپنی پوری تابانی پر تھا۔ خواتین نے اپنا تازہ کلام سنایا رابعہ جو کہ عروض سے پوری طرح واقف تھی پہلے اس نے لڑکیوں کا کلام غور سے سُنا۔ پھر ان کو ٹوکا کہ یہ کیا ہوا غزل میں بحر کا خیال کیوں نہیں رکھ رہی ہیں۔ قندھار سے آئی ہوئی ایک شاعرہ کا بڑا شہرہ تھا۔ اسی محفل میں مشہور شاعر روش دل خضداری بھی موجود تھے۔ بعض عورتوں نے مرد شاعر کی موجودگی کو بُرا مانا۔ لیکن رابعہ نے کہا کہ شاعر لوگ بے ضرر ہوتے ہیں۔ روش دل خضداری نے رابطہ کار کا شکر ادا کیا۔ رابطہ کار نے روش دل خضداری کو کہا

کہ آپ کے کلام کی شہرت آپ کو یہاں لے آئی ہے۔ خضداری نے کہا کہ میں کلام تو ضرور پیش کروں گا لیکن ایک عرض ہے کہ محفل کا کچھ رنگ سخن مجھ سے متعارف کروالیا جائے تو موزوں کلام کا انتخاب کر سکتا ہوں۔ گل بانو نے سارنگی تھامے کچھ پیش کیا۔ بعد ازاں سب خواتین نے اپنا کلام پیش کیا۔ روشن دل خضداری نے شعر کی مناسبت سے ہر شعر کے ٹکڑے پیش کیے۔ گل بانو کی بانسری نے محفل میں شعر کو چار چاند لگا دیے آخر میں رابعہ نے کہا:

کتنا زیادہ خون میرے دل میں جمع ہو گیا ہے

مگر دل سے گل لالہ رنگ لے گیا ہے

اس کی یاد میں آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا ہے

میرا پورا جسم سیلاب کی مانند بن گیا ہے

چونکہ میں نے تیرے چہرے کی ہریالی دیکھی ہے۔

روشن خضداری اور رابعہ خضداری کے کلام کے دوران خوب است،

صبح کی روشنی میں مناظر فطرت پرندوں کی چہچہاہٹ، شبنم کے موتی اور اس پورے منظر پر چھائی ہوئی قمری کی کوک اس کو کئی سوالوں کا جواب دے جاتے ہیں یوں رات کا معمہ صبح کی روشنی میں حل ہونے لگتا مگر فکر کی گہرائی اس کو ہر وقت بے چین رکھتی۔ امیر کعب جب ایک عشائیے میں اپنے صاحبزادے حارث سے مخاطب ہوتے ہیں کہ:

"آج رات جشن رکھا ہے اس میں دختر کعب (رابعہ خضداری) بھی ہمارے ساتھ تشریف رکھیں گی"۔(۲۴)

حارث جواباً کہتا ہے کہ والد محترم یہ پردے کے اندر سے بھی تو شریک محفل ہو سکتی ہیں۔ باپ بیٹے کی محبت اور حارث کی اپنے باپ سے چپقلش رشتوں میں دراڑ پیدا کرنے کی سازش ہے جسے رابعہ پسند نہیں کرتی۔ رابعہ ایک عورت ہونے کے ناطے اپنے خاندان کو بکھرا ٹوٹا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کا بھائی اس کے والد کے ساتھ نہ الجھے بلکہ محبت کا ثبوت دے۔ امیر کعب کی بیماری کے وقت رابعہ خضداری کا بے چین ہو جانا بیٹی کا باپ سے محبت کا سلوک چھلکتا ہے۔

حارث ایک سفر پر جاتا ہے تو اس کے تہ خانے کی چابی اس کے قریبی ساتھی سارنگ کے پاس ہوتی ہے وہ گل رعنا (یہ رابعہ شہزادی کی قریبی دوست اور ہم راز تھی) کو حارث کے بہکاوے میں اپنے پاس بلاتا ہے تو گل راعنا شہزادی کے ساتھ وفاداری کرتے ہوئے سارنگ کے مشروب میں بے ہوشی کرنے والی دوائی ڈال دیتی ہے اور پھر سارنگ سے زندان کی چابیاں لیتی ہے جس کی مدد سے رابعہ اور گل رعنا بیکتاش کو زندان سے نکال دیتے ہیں۔

حارث قندھار کی فوج سے مدد کے لیے گیا ہوا تھا تاکہ مقامی بغاوتوں کو کچل سکے جب وہاں سے ناکام لوٹا اور واپس آکر پتہ چلا کہ بیکتاش کو زندان خانے سے فرار کروا دیا گیا ہے تو اس نے بڑے غضب کے ساتھ سارنگ سے پوچھا کہ اتنے سخت پہروں کے باوجود ایسے کیسے ممکن ہوا تو اس نے سارا واقعہ سنا دیا۔ حارث شدید غصّے میں بغیر اجازت زندان خانے میں داخل ہوا اور رابعہ سے پوچھا کہ کیا یہ تم نے کیا ہے؟

رابعہ کے جواب کے بعد اس نے کہا کیسی بہن ہے جو اپنے بھائی کے دشمن سے عشق کرتی ہے اور ان کی مدد کرتی ہے لیکن رابعہ نے بڑا مطمئن ہو کر کہا کہ میں نے مظلوموں کا ساتھ دیا ہے اور یوں رابعہ مخلوق کے لیے آسانیوں کا سبب بنتی ہے اور علامہ فیض الحسن کی تعلیمی پرورش اور نیک نیتی کی وجہ سے وہ عشق مجازی جس کا سفر بیکتاش غلام سے شروع ہوا تھا وہاں سے لے کر عشق حقیقی تک پہنچ جاتی ہے۔

رابعہ خضداری یہاں عاشق کا رول ادا کرتی نظر آتی ہے جو بہت عقلمندی سے بیکتاش کو زندان سے رہائی دلاتی ہے اور پھر اپنے بھائی کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور حق اور سچ کی آواز بلند کرتی نظر آتی ہے لیکن اس کا انجام موت کی صورت میں ہوتا ہے۔ رابعہ کا بھائی حارث اس کی دونوں ہاتھوں کی نبض کاٹ دیتا ہے۔ اس دوران وہ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہے اور حارث کو نصیحت کرتی ہے کہ اللہ توبہ کا دروازہ بند نہیں کرتا پھر اسی لمحے دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔

"چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" کے مرکزی نسوانی کرداروں میں صنفی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ: قرۃ العین طاہرہ کے حوالے سے لیا جائے تو یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ قرۃ العین طاہرہ جو بابی تحریک کا ایک نسائی کردار ہے۔ اس کی صنفی شناخت ایران میں بابی تحریک کی سرگرم کارکن کے طور پر ہوتی ہے۔ اس نے ابتدائی تعلیم

اپنے چچا اور سسر محمد تقی سے حاصل کی اور بابی تحریک کے بانی علی محمد باب سے بڑا متاثر تھی جو کہ جاگیر داری نظام، بادشاہی نظام کے خلاف تھی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ آزاد لوگوں کو غلام بنانا بہت بڑی ظلم ہے۔ ہم امام مہدی کے ظہور سے پہلے راہ ہموار کرنا چاہ رہے ہیں کہ لوگ آزادی سے اپنے فیصلے کریں، آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کریں، ملک کے وسائل پر سب کا مساوی حق ہو۔ بادشاہ کے دروغے لوگوں کی اسی طرح قدر کریں جس طرح بادشاہ کی کرتے ہیں۔ ان چیزوں کو لے کر وہ آگے چلی تھی۔ ناول میں اس کا ایک مرکزی کردار ہے جس نے اپنی صنفی شناخت کو برقرار رکھا ہے۔ جب ۱۸۵۰ء میں جب بابی تحریک ایران میں زوروں پر تھی تو بڑے بڑے علمائے کرام اور اس وقت بڑے بڑے جاگیر دار تھے۔ ان لوگوں نے ان کو تہ تیغ بھی کیا۔ قرۃ العین طاہرہ نے کبھی بھی اپنے کارکنوں کو لوگوں کے قتل عام کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ ہمیشہ پیار کا درس دیتی تھی اور لوگوں کو قانون کا احترام کرنے کے لیے بھی کہتی تھی۔ اُس وقت کے مشہور اسکالر کاظم رشتی سے اس کی جو خط وکتابت ہوئی۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتی ہے کہ مجھے اپنی شناخت ایک انسان کے طور پر بنانی ہے کیونکہ مرد عورتوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ جب کہ عورت ماں ہے، بیوی ہے، بیٹی ہے، بہن ہے لیکن پھر بھی زمانے میں ذلیل ہے اور زمانہ اسے قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اس سے بڑھ کر گھٹیا سوچ اس معاشرے میں کیا ہو سکتی ہے؟ خدا اور آدمی کا جو رشتہ ہے وہ تمام انسانوں کو برابری کا حقوق دیتا ہے۔ یہ مرد ہی ہیں جو عورت کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ عورت کے بغیر مرد اور معاشرہ نامکمل ہے۔ کاظم رشتی بھی اس کی عقل کی داد دیتا تھا۔ کاظم رشتی وقت کا مشہور اسکالر تھا جو کہ نجف اشرف کے مدرسے کا پرنسپل تھا۔ اس وقت کا ایرانی معاشرہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ ان کی آزادی کے لیے ایک عورت جدوجہد کر رہی ہے۔ وہ خانقاہی نظام کو رد کرتی ہے اور لوگوں کی بدعقیدگی کا کھلے عام مذاق اڑاتی ہے۔ عربوں کو وہ اس لیے عظیم مانتی ہے کہ وہ ہر ایک کی عزت نفس کی قدر کرتے تھے، شجاع تھے، بہادر تھے اور ان کے ہاں کوئی چیز ذاتی نہیں بلکہ قومی معنی رکھتی تھی۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے اس نسائی کردار میں بار بار اس چیز کا ذکر کیا ہے کہ ناول کا مرکزی کردار صبر کا استعارہ بھی ہے اور بابی تحریک کی جان بھی ہے۔ یہ خوبصورت نسائی کردار جس نے اپنی صنفی شناخت کو برقرار رکھا ہے۔ ایک عظیم کردار کے طور پر سامنے آیا ہے۔ قرۃ العین طاہرہ فلسفہ، سیاسیات، مذہبیات کی ماہر اور صوم وصلوۃ کی

پابند خاتون کا کردار ہے۔ اگر بابی تحریک کے کارکن بادشاہ پر حملہ نہ کرتے تو یہ تحریک کامیاب ہو جاتی۔ قرۃ العین طاہرہ نے اپنی جان دے دی لیکن اپنے الفاظ سے منحرف نہیں ہوئی۔ بادشاہ نے اس کو شادی کا پیغام بھیجا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں جھوٹے لوگوں کے قابل نہیں ہوں۔ میں سچائی کی موت مرنا چاہتی ہوں۔ جھوٹ کے سونے کے پنجرے میں قید ہونا پسند نہیں کرتی۔ یہی میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہے۔ ناول کے شروع میں جمیلہ ہاشمی نے شہدائے کربلا کا ذکر کیا ہے جن کا بلند ترا استعارہ صبر تھا۔ قرۃ العین طاہرہ نے کلمہ حق جیسا کہ کلمہ حق شہدائے کربلا نے کہا تھا اور اپنی جان دے دی تھی یہی ناول میں اس کا مرکزی کردار ہے۔ بابی تحریک اور انقلابیوں کی جان تھی۔

قرۃ العین طاہرہ ایسے معاشرے میں رہتی ہے جہاں عورت کی زندگی گھر تک محدود ہوتی ہے اور عورت کا تعلیم حاصل کرنا یا گھر سے باہر کے امور کو دیکھنا نہایت مایوس سمجھا جاتا ہے لیکن قرۃ العین طاہرہ بہت آزاد طبیعت کی مالک ہے۔ وہ اپنے گھٹن زدہ ماحول سے نکل کر زندگی کو جینا چاہتی ہے۔ وہ کتابوں کا علم حاصل کرتی ہے اور دیگر حقیقتوں سے بھی آشنا ہوتی ہے۔ قرۃ العین طاہرہ شعر کہتی ہے اس کے اشعار رومانی ہیں۔ قرۃ العین ایسی تمام زنجیروں اور پابندیوں کو توڑنا چاہتی ہے جو اسے جکڑ کر رکھنا چاہتی ہیں۔

شاعری کے حوالے سے قرۃ العین طاہرہ کافی شہرت حاصل کر رہی تھی۔ ایسے دور میں کسی بھی عورت کے لیے شاعری کرنا یا شہرت پانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ان کے مخالفین بڑھتے چلے گئے اور قرۃ العین طاہرہ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی آزادی نے زندگی کو بہت دشوار بنا دیا لیکن قرۃ العین طاہرہ نے نہایت ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> "ام سلمٰی جسے ہم قرۃ العین طاہرہ کے نام سے جانتے ہیں، ایسی بے قرار روح کی مالک تھی جس کے پاس دل بھی بڑا تھا اور دماغ بھی۔ جو حق کی

تلاش میں ساری عمر سرگرداں رہی اور حق کی تلاش میں ہی جان دے

دی"۔(۲۵)

بادشاہ ناصر الدین قرۃ العین طاہرہ کو ملکہ بنانے کا پیغام بھیجتا ہے جس سے وہ انکار کر دیتی ہے اور بالآخر بادشاہ کے حکم پر اسے گلا گھونٹ کر قتل کر دیا جاتا ہے۔

انسانی نفسیات کی عکاسی جمیلہ ہاشمی کے ناول میں کرداروں کی نفسیات کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے، جس میں وہ شخصیت کی مختلف پرتوں کو سامنے لاتی ہیں۔ "چہرہ بہ چہرہ" میں بھی وہ انسان کے اندرونی تضادات اور احساسات کو بڑی خوبی سے بیان کرتی ہیں۔

ہاشمی کی تحریروں میں معاشرتی مسائل کی کھلی تنقید ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف فرد کے اندرونی کشمکش کو دکھاتی ہیں بلکہ معاشرتی رویوں، رواجوں اور لوگوں کے تصورات کی بھی تجزیہ کرتی ہیں۔

خواتین کے مسائل اور خودشناسی: جمیلہ ہاشمی نے خواتین کی مشکلات، ان کی اندرونی خواہشات، اور معاشرتی جبر کے بارے میں گہرائی سے لکھا ہے۔ "چہرہ بہ چہرہ" میں بھی خواتین کی داخلی دنیا اور ان کی شناخت کے مسائل کو دکھایا گیا ہے۔

ان کی تحریروں میں اس بات کی عکاسی ملتی ہے کہ انسان اپنی ذات اور اپنے اردگرد کے ماحول میں توازن قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالات اور سماجی روایات سے ہم آہنگ ہونے کی جدوجہد ان کے ناول کی بنیاد ہے۔

اس ناول اور جمیلہ ہاشمی کے دیگر کاموں میں ان کی فکری گہرائی اور انسانیت کے موضوعات پر روشنی ڈالنے کی کوششیں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ The New Encyclopedia Bertinca valume 19,15th edition, page:160

۲۔ میر یلین فرنچ: ”عورت کے خلاف جنگ پر محاذ“، مترجم مسعود اشعر، مرتبہ کشور ناہید، مشمولہ ”عورت زبان خلق سے زبان حال تک“، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۰ء ص ۱۳

۳۔ ضمیر علی بدیوانی / فاطمہ حسن، نسائیت کی تحریک اور اردو ادب، مکالمہ (کتابی سلسلہ ۰۱)، کراچی: اکادمی بازیافت، جنوری تا جون، ۲۰۰۳، ص ۲۱

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تانیثیت مشمولہ تضمین (سہ ماہی)، لاہور: حافظ جمیل پرنٹنگ پریس، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۷، ص ۷

۵۔ زاہد محمود، ڈاکٹر، گھریلو تشدد۔ وجوہات، اثرات اور انسداد، لاہور: نگارشات، ۲۰۰۶ء، ص ۲۵-۲۶

۶۔ سہیل احمد خان، محمد سلیم الرحمن (مؤلفین): ”منتخب ادبی اصطلاحات“، لاہور، شعبہ اُردو جی سی یو، ۲۰۰۵ء، ص ۸۷

۷۔ شمس الرحمان فاروقی: ”تانیثیت کی تفہیم“، مشمولہ ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء شمارہ ۵۹، ص ۲۰

۸۔ کلیم احسان بٹ: ”تفہیم و تحسین“، گجرات روزن پبلشر، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۵

۹۔ آزادی نسواں کا فریب ”فرید بک ڈپو پرائیوٹ لمیٹڈ، دہلی ۱۹۹۹ء“ ص ۱۶

۱۰۔ کشور ناہید، بُری عورت کے خطوط، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۲

۱۱۔ سعد اللہ جان برق، حوّا کی بیٹیاں۔ یوندا اور اقلیمیا مشمولہ دخترِ کائنات، لاہور سانجھ پبلی کیشنز ۲۰۰۸ء ص ۱۰۲-۱۰۳

۱۲۔ عبدالرحمن خان، ایم، عورت انسانیت کے آئینے میں، لاہور شیخ اکیڈیمی، ۱۹۷۴ء، ص ۲۸

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ عبدالکریم ذاکر نائیک، ڈاکٹر، اسلام میں خواتین کے حقوق ۔ جدید یا فرسودہ، لاہور: دارلنوارد، ۲۰۰۶ء، ص ۳

۱۵۔ Kishwer Naheed , women myth & realities. Lahore ,sang-e-) meel publications 2008, page:190

۱۶۔ عبدالکریم ذاکر نائیک، ڈاکٹر، اسلام میں خواتین کے حقوق ۔ جدید یا فرسودہ، لاہور: دارلنوارد، ۲۰۰۶۲۲۰۰۶ء، ص ۲۵

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ اِبن حنیف، دُنیا کا قدیم ترین ادب، جلد دوم، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹۱

۱۹۔ عبدالکریم ذاکر نائیک، ڈاکٹر، کیا حجاب عورت کا استحصال نہیں، س۔ن، ص ۱

۲۰۔ مبارک علی ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، لاہور فکشن ہاوس، ۲۰۰۵ء ص ۸۔۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۹۔۱۷

۲۲۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، می سوزم، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۳

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۷

۲۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، "جمیلہ ہاشمی کے دوناول" معاصر ادب (سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء) ص:۱۱۶

باب سوم:

منتخب اردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں میں صنفی شناخت کی عکاسی

مرد و عورت کے مابین صنفی امتیازی سلوک برتے جانے کے حوالے سے ڈاکٹر حمیرہاشمی کا کہنا ہے:

"تحقیق سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مردوں اور عورتوں میں امتیاز کرنے کا کوئی خاطر خواہ جسمانی یا نفسیاتی جواز نہیں ہے اور اگر ہم اس بات پر اڑے رہیں کہ مرد و زن مختلف ہی ہیں، تو جب کبھی ور جہاں بھی کوئی فرق نظر آیا ہے، وہ عورتوں کی حمایت میں ہی جاتا ہوا پایا گیا ہے، پھر بھی عورتوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے، اس امتیازی سلوک کی جڑیں دراصل ان رویوں میں پائے جانے والے اختلافات میں موجود ہیں، جو معاشرے عمومی طور پر مردوں اور عورتوں کی جانب روا رکھتا ہے، جب کہ در حقیقت دونوں جنسوں میں کوئی نمایاں حیاتیاتی یا نفسیاتی تفاوت موجود نہیں ہے.... معاشرے میں عورتوں کو مردوں سے علیحدگی کی وجہ سے عورتیں ایک طرف، تو بڑی محبت کرنے والی، خیال رکھنے والی اور مددگار بن جاتی ہیں اور دوسری جانب وہ لازماً محتاج، دوسروں پر انحصار کرنے ولی، کمزور اور کمتر ہو کر رہ جاتی ہے۔"(۱)

مرد و عورت کی تربیت کے مختلف انداز اپنانے سے ایسے افراد معاشرہ منظر عام پر آتے ہیں، جن کی اصلاح ایک خاص پروپیگنڈا کے تحت کی جاتی ہے:

”مردوں کو مردانہ رویے سکھائے جاتے ہیں، یعنی مضبوط، جفاکش، جارح اور پر اعتماد بننا سکھایا جاتا ہے۔ مردوں کے جذباتی، نرم دلی یا کمزور ہونے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ عورتوں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ حساس، شرمیلی، خدمت گزار اور جاں نثار بنیں، ان کے بہت زیادہ اعتماد، حصولِ پسند یا حاوی ہونے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے، یوں جنسی کردار کی تربیت یا مردانہ یا زنانہ رویے سیکھنا اس دنیا میں آمد کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے اس سنِ بلوغت اور پختہ عمر میں بھی حاوی رہتا ہے۔“(۲)

مولانا ابو الکلام آزاد کا بھی یہ موقف ہے کہ مرد و عورت کی دماغی قوتیں یکساں ہوتی ہیں، صرف موقع ملنے کی بات ہے، عورت کی بہ نسبت مردوں کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کا لوہا منوا سکیں، وہ مردوں کی شانہ بشانہ دکھائی دیتی ہیں:

”آج علمِ تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ مرد اور عورت دماغی قوتوں میں بالکل برابر ہیں اور ثبوت کے ساتھ انھیں عام آزادی بھی دے دی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں کوئی کام ایسا نہیں ہے، جسے مردوں کی طرح مغربی عورتیں انجام نہ دیتی ہوں۔ ڈاکٹر عورتیں ہیں، پروفیسر عورتیں ہیں، اور لیکچرار عورتیں ہیں، غرض کہ ہر میدان میں عورتیں مردوں کے برابر ترقی کر رہی ہیں۔ یہ نظیر بھی بتلا رہی ہے کہ اگر عورتوں کو مردوں کے تسلط دسے نجات ملے اور اعلیٰ تعلیم سے مردوں کی طرح فائدہ اٹھائیں تو وہ کسی چیز میں مردوں سے کم رتبہ ثابت نہیں ہو سکتیں۔“(۳)

جس کی وجہ سے ایک طرف ان کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوا ہے، تو دوسری طرف معاشی مسائل کا حل نکالنا ان کے لیے آسان ہو گیا ہے۔ پاکستان میں عورت کو درپیش مسائل مذہبی، قانونی، معاشرتی و معاشی نفسیاتی نوعیت کے ہیں، جن میں ہندوانہ اور اسرائیلی رُسومات کی آمیزش نظر آتی ہے۔ یہاں اسلام کی تعلیمات بظاہر حاوی ہیں، لیکن صحیح اسلامی اقدار تک رسائی کے مواقع بہت کم ہیں، جس کی بنیادی وجہ قرآن پاک کی تعلیمات کو نظر انداز کیا جانا ہے، اگرچہ قرآن پاک میں روزمرہ زندگی کے تمام مسائل کا ذکر ہے اور ان کا حل بھی موجود ہے، لیکن زمانہ پرور لوگ اپنی ذاتی نظریاتی بنیادوں پر اسلام کا پرچار کرتے ہیں، اس بارے میں ارشاد احمد کا کہنا ہے:

"پنجابی سماج میں پیدا ہوتے ہی حقارت اور افسوس کی نظر سے دیکھی جاتی ہے لہٰذا لڑکی کی پیدائش پر کوئی خاص رسم ادا نہیں کی جاتی ہے، بلکہ تمام عزیزوں کے منہ لٹک جاتے ہیں اور ایک طرح سے کئی روز تک دلی سوگ منایا جاتا ہے، لوگوں کے خیال کے مطابق بیٹی انسان کے لیے گوناں گوں مسائل پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ قدیم زمانے سے بدظنی عام ہے کہ بیٹی کے جنم کے ساتھ ہی عزت وناموس کے لیے خطرات جنم لیتے ہیں، غرض کہ اس کی آمد ماں باپ کے دل و دماغ کے لیے مستقل بوجھ بن جاتی ہے اور لڑکی کی زندگی سے وابستہ مختلف قسم کے اندیشے ان کے شب و روز کا آرام حرام کر دیتے ہیں۔"(۴)

بیٹیوں سے ناروا سلوک کے حوالے سے رابعہ الرّبا کا کہنا ہے:

"اس طرح کے امتیازی سلوک سے لڑکیوں کی ذہنی تربیت بہت متا ثر ہوتی ہے ان میں احساس کمتری پیدا ہو جاتی ہے وہ خود کو محکوم و کمزور سمجھنے لگتی ہیں، یہی کمی ان کی آئندہ زندگی پر ایسی اثر انداز ہوتی ہے کہ وہ بہ طریق احسن اپنے شوہر کے حقوق بھی پورے نہیں

کر سکتیں ، پھر اولاد کی تربیت میں بھی کمی کہیں نہ کہیں نظر آتی ہے۔"(۵)

☆ بدھ مت دُنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کو مذہبی اُمور کی ادائیگی میں شامل نہیں کیا۔

☆ بدھ مت میں عورت کی عزت نہ تھی ، ان کے خیال میں عورت کے پاس چوروں کی طرح حربے ہوتے ہیں یعنی وہ کسی وقت بھی کوئی نہ کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے۔

☆ بدھ مت نے اپنے ماننے والوں کو یہ بھی حکم دیا ہے کہ اگر آپ کو نجات حاصل کرنی ہے تو عورتوں سے اپنے تعلقات ختم کر لو اور خود مہاتما بدھ نے بھی اپنی بیٹی سے دوری اختیار کر لی تھی۔(٦)

☆ مذہب اسلام میں مرد و عورت دونوں مساوی انسان ہیں اور انسان کو احسن تقویم سے پیدا کیا گیا ہے۔

☆ مرد کو عورت پر فوقیت اور جائیداد میں دوگنا حصے کی وجہ نان نفقہ کی ذمہ داری ہے۔

☆ عورت رزق حلال کما سکتی ہے، اس کی کمائی پر مرد کا حق نہیں جب کہ مرد کی کمائی پر بیوی کا پورا حق ہے۔

☆ عورت مہر اور وراثت کی حق دار ہے، جس طرح مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے، اُسی طرح عورت کو خلع کا اختیار حاصل ہے۔

☆ ناگزیر حالات میں مرد کی طرح عورت کو بھی نکاح ثانی کا حق دیا گیا ہے۔

☆ عورت کو بہ حیثیتِ ماں، بہن ،بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے باوقار زندگی گزارنے کا تحفظ دیا گیا ہے۔

☆ اسلام میں بچوں کی تعلیم و تربیت میں اور باپ مساوی کردار ادا کرتے ہیں۔

مرد کو حاکمانہ طبیعت کی نفسیاتی وجوہ میں نمایاں عنصر ،مرد کی عورت پر مکمل اجارہ داوی کا حق تصور کرنا ہے۔ابتداً عورت کو اعلیٰ درجات حاصل تھے ، لیکن جس اُس کا خون کا رشتہ یا شادی مردانہ حاکمیت والے طبقے سے ہوئی تو مرد نے خود کو تمام معاملات کا کرتا دھرتا ثابت کرنے کے لئے عورت کو

اپنا ماتحت بنایا اور عورتوں کے جسم، جنس و تولیدی صلاحیت کو اپنی ملکیت تصور کرتا تھا، حتیٰ کہ اُس عورت کے لئے جائیداد کا حصول یا منتقلی کھٹن اور بعض صورتوں میں ناممکن کر دی۔(۷) نفسیاتی نقطی نظر سے دیکھا جائے تو مرد و عورت میں فطری تضاد پایا جاتا ہے، یہ امتیاز جسمانی نفسیاتی سطح پر ہے، لیکن اس انداز سے کہ کسی ایک خصوصیت میں مرد کا پلڑا ابھاری اور کسی میں عورت کا۔ معاشرے میں مرد و عورت کی تفریق انسانی تاریخ کا حصّہ ہے۔ عورتوں کو ان کے معاشی اور سیاسی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ اور رومانی و ذہنی طور پر غلام بنا کر اُن کی زندگی کے دائرہ عمل کو گھر کی چار دیواری تک مخصوص کر دیا گیا۔ سرمایادار نظام میں جنس کی بنیاد پر امتیازی تفریق کے حالات پیدا کئے گئے، جو آج بھی زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہیں: ”خواتین یا ہماری 'خاموش اکثریت' کے خلاف یہ امتیاز بلا تخصیص جاری ہے۔ ماہرینِ نفسیات اُسے 'سیکس ازم'، 'جنسی امتیاز' یا جنس کی بنیاد پر امتیازی سلوک کا نام دیتے ہیں۔(۸)

عیسائیت میں عورت کے بارے میں افکار و نظریات کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ یہ اخلاقی، تاریخی، عالمگیری، توحید پرست اور نجات دہندہ مذہب ہے جس میں خدا اور بندے کے تعلقات کا درمیانی واسطہ خداوند یسوع کی ذات کو کہا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں:

☆ عورت بگاڑ پیدا کرنے والی انسانیت کی پہلی مجرم، شطانیت کی پیروکار، جھوٹ بیٹی، دوزخ کی سپاہی اور امن کی دشمن، سانپ کا زہر اور اژدھے کا کینہ رکھنے والی ہے، اس لیے راندۂ درگاہ ہے۔

☆ مسیحی شریعت کی رُو سے عورت مکمل طور پر مرد کے قابو میں تھی۔ طلاق و خلع کی بھی اسے اجازت نہ تھی، اس کی تعظیم مریم پرستی کا نتیجہ قرار پائی۔

☆ نکاح نہ کرنے اور مجرد زندگی گزرانے کو اللہ کی اور حضرت مسیح کی خوشنودی کا حصول قرار دیا گیا۔ دوسری طرف اس کا کام صرف یہ تھا کہ وہ بچے پیدا کرے۔

☆ عورت کو اپنی کمائی پر کوئی اختیار نہ تھا اور نہ ہی اس کے لئے نان نفقہ کا کوئی قانون تھا۔ وہ اپنے شوہر کی کسی چیز کی مالک و مختار نہ تھی، بلکہ ہر چیز کا مالک و مختار اس کا شوہر تھا۔

☆ شادی کر کے مصائب و مشکلات کا شکار ہونے کی بجائے خود کو بدکاری اور گناہ کی دلدل مین گر جانے کو ترجیح دیتی ہے نہ کہ ایک مرد کی قیدی بننا اور وہ محض جسمانی تسکین کا ذریعہ ہے۔

☆ چرچ کے مطابق عورت میں بچے پیدا کرنے کی اہلیت تو ہے، لیکن وہ اس کی تربیت کرنے کی اہل نہیں ہے۔ بچوں کی ذہنی وجسمانی تربیت باپ کے ذریعے ہے۔(۹)

☆ عیسائیت میں عورت کے پردے کے حوالے سے ،جو تعلیمات ملتی ہیں، اُن کے متعلق بائبل میں ہے کہ رہبانیت اختیار کرنے والی عورتوں کو مردوں کی طرح لباس پہننا منع ہے ، تاہم خواتین کا لباس بنیادی طور پر وہ ہی ہے، جو مرد پہنتے ہیں۔ خواتین نے مختلف حالات میں جدت اختیار کرتے ہوئے خوبصورت لباس بنائے ہیں، جو اُس کی اپنی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ بائبل میں بہت سے مضامین عورتوں کے لباس کے حوالے سے موجود ہیں، اُن میں سے کچھ ایسے ہیں، جو اس کے صحیح ترجمان نہیں۔(۱۰)

☆ ہندو مذہب میں مرد اپنے زور و بازو سے نجات کا رستہ پکڑ سکتا ہے مگر عورت کے لیے نجات کا واحد راستہ شوہر کی خوشنودی ہے۔

☆ خانقاہوں میں مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے زناکاری کو تقویت پہنچی۔

☆ جو شخص اپنی بیٹی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھاتا، اسے انعام سے نوازا جاتا۔

☆ برہمن کو یہ قانونی اجازت حاصل تھی کہ وہ نچلی ذات کے ہندو کی عورت سے ہم بستر ہو جائے۔

☆ ہندو مذہب کے مطابق عورت سماج کی ناپسندیدہ ہستی ہے اور اسے اچھوت اور نااہل سمجھا گیا۔

☆ ستی کی رسم کو اہمیت دی گئی۔(۱۱)

☆ ہندو معاشرے میں عورتیں جوئے میں ہاری جاتی تھیں۔

☆ ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے ، بیوہ عورت قانونی طور پر ہر لذت سے محروم کر دی جاتی تھی۔

☆ لڑائی میں ہار جانے کے ڈر سے عورتوں کو خود اُن کے باپ، بھائی اور شوہر قتل کر ڈالتے تھے۔

☆ محرمات سے تمتع کار ثواب سمجھا جاتا تھا اور عصمت کو کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ نیوگ کا رواج عام تھا۔(۱۲)

بعض دیہی علاقوں میں اور پختونوں میں شادی کے نام پر بچیاں فروخت کی جاتی ہیں، اس کی قیمت، اس کے قد کاٹھ کے مطابق مقرر کی جاتی ہے، جو کہ ایک لاکھ روپیہ ہے، جو اباً لڑکی دماغی یا جسمانی طور پر معذور، بوڑھے، ڈاکو، نشئی سے بیاہ دی جاتی ہے۔ پرانی دشمنیوں کو ختم کرنے یا قتل کا خون بہا دینے کے لیے بھی لڑکیاں دان کی جاتی ہیں:

> "چاچا نے قتل کیا مگر سزا مجھے ملے گی آہ! ڈھول تاشے والے آئیں گے، اور ناچیں گے گائیں گے میں اپنی قسمت کو کوستی ہوں جس نے مجھے گائے کے برابر بنا دیا ہے۔ مجھے ذبح کیا جائے رہا ہے۔" (۱۴)

کم سنی کی بے جوڑ شادیاں بھی بہت سے مسائل کو جنم دیتی ہیں، عدم مطابقت، رد عمل، جارحانہ انداز اور ذہنی بعد، بہت سی الجھنوں کا باعث بنتا ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام میں عموماً ماں کو بچوں کا دشمن ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ بات بات پر اولاد کے سامنے ماں باپ کے خلاف اُگلا جانے والا زہر بچوں کے معصوم ذہنوں کو دوہری کشمکش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جو مرد اپنی بیوی کے ساتھ جور و ستم، ذہنی و جسمانی تشدد، لڑائی جھگڑے، دھونس اور بے جا حاکمانہ رویہ اختیار کرتا ہے، اپنے سخت گیر رویے کی وجہ سے سسرال کی بد تعریفیاں اس کے حصّے میں آتی ہیں۔ بچے باپ کے خلاف ناخوش گوار کلمات سن کر ٹینشن اور ڈپریشن کا شکار ہوتے ہیں، جب کہ باپ کی جانب سے ماں سے تلخ و ترش رویہ اور اخلاقی بدصورتی بچوں کے آدرش کو شدید متاثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا مرد و عورت کی تعلیم کو بنیادی اثاث قرار دیتے ہیں، ان کے خیال میں علمی اور ادبی حوالے سے بھی عورت نے ان بنیادوں کو چیلنج کیا ہے، جن پر مردوں کی برتری کا نقش ثبت کیا جاتا رہا ہے:

> "مرد معاشرے نے برتر سطح پر مرد کو، جب کہ کم تر سطح پر عورت کو دکھایا ہے اور یوں اُسے زمین، بدی، تاریکی وغیرہ سے جوڑ کر "تذکیریت" کا مظاہرہ کیا ہے، اس سلسلے میں ساخت شکنی سے جُڑی ہوئی خواتین نے سماجی مذہبی نیز علوم و فنون کی سطح پر جس متشددانہ انداز میں مرد معاشرے پر تنقید کی ہے وہ اب مغربی فکر حصّہ ہے،

مشرق میں نوبت یہاں تک نہیں پہنچی ، لیکن عام زندگی میں"
تذکیریت" کی نشاندہی اب ہونے لگی ہے"۔(۱۴)

دونوں عالمی جنگوں کے دوران مردوں کی تعداد میں کمی کے باعث خواتین نے زندگی کے مختلف شعبوں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور ثابت کیا کہ معاشرہ عورت کی خدمت کا محتاج ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں آئی کون روزی ورکنگ ویمن کونسل کی نمائندہ کے طور پر سامنے آئی۔ سوشلزم اور کیمونزم نے خواتین کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے سیاست میں بھی حوصلہ افزائی کی۔ نازی جرمنی جو آمریت پسند معاشرہ تھا، اس میں بھی عورتوں کی بڑی تعداد نے مردوں کے برابر حصّہ لینا شروع کیا، اس انقلاب سے دُنیا بھر میں جینڈر یعنی صنفی تفاوتی قوانین یں بھی متعین کیے جانے لگے۔اس حوالے سے کشور ناہید کا کہنا ہے:

"عورتوں کے حقوق کی حمایت میں فکر و خیال کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے ، کرستین ڈپیاں، میری وولسٹو نیکرافٹ ، جارج سینڈ اور بیسویں صدی کی دوسری لکھاری خواتین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور پھر انقلابِ فرانس میں سے حقوقِ نسواں کی تحریک بھی پھوٹ پڑی تاہم سیاسی حلقوں میں بڑے پیانے پر یہ تحریک ۱۸۴۸ءسے اور امریکہ سے سینیکا فالز تحریک سے شروع ہوئی.... اس تحریک سے صرف اشرافیہ کے مرد ہی نہیں تمام مرد زچ ہونے لگے، کیوں کہ اس سے گھر میں عورت اور مرد کا آمنا سامنا ہونے لگا، مزدوروں کی تحریک کے برعکس اس تحریک نے مردوں کو اس پہلو سے جالیا جہاں وہ کمزور تھے، اس صدی میں حقوقِ نسواں کی تحریک نے نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اُنھیں تعلیم، سیاسی حقوق اور ملازمتوں تک رسائی حاصل ہوئی، دوہرے معیار قائم کرنے والے

قوانین کو ختم کرایا، جو زیادہ تر صنعتی اور سوشلسٹ ممالک میں رائج تھے۔"(۱۵)

مشرق وسطیٰ اور شمالی امریکہ میں خواتین میں مزدوری کے مسائل نسبتاً کم ہیں، کیوں کہ یہ مما لک دولت سے مالا مال ہیں۔ ڈاکٹر نوال نے عرب ممالک میں غلاموں اور کنیزوں سے رکھے جانے والے ناروا سلوک کی مذمت کی ہے، اِن کے خیال اسلام سے قبل ومابعد کنیزوں اور لونڈیوں کو رکھنے والے قبائل نظام کی شدید مذمت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"باقی تمام قبائل میں پدری نظام انتہائی مضبوط تھا، اِس نظام کا جو تانا بانا مرد کے لا محدود غلبہ کی بقا کے لیے بُنا گیا تھا، وہ ہمیشہ کی طرح مضبوط اور ناقابل شکست رہا قبائل میں مسلسل جنگ و جدل، جس میں مرد مرتے تھے، جنگوں میں مالِ غنیمت کے طور پر آنے والی متعدد جنگی قیدی خواتین اور لونڈیاں اسی طرح نئے اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت کے سبب، تعدد ازدواج ایک معاشرتی ضرورت بن کر اُبھری، چنانچہ اسلام نے مردوں کی جنسی آزادی، ایک سے زیادہ شادیوں کے علاوہ لونڈیاں اور کنیزیں رکھنے کے حق پر مذہب کی مہر لگا دی، عملاً ایک بار پھر غلاموں کے آقاؤں قبائلی سربراہوں اور امیر لوگوں کو ایسے حقوق وفوائد سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، کیوں کہ صرف اِن ہی لوگوں کے پاس اتنی عورتیں خریدنے اور رکھنے کے وسائل تھے۔"(۱۶)

اس ناول میں تانیثی تنقید کی روشنی میں یہ بات اہم ہے کہ جمیلہ ہاشمی نے عورت کے استحصال، معاشرتی دباؤ، اور آزادی کی خواہش کو بہت خوبی سے اُجاگر کیا ہے۔ ان کی تحریر میں عورت کی آواز، اس کا شعور اور اس کے حق میں کھڑے ہونے کی تڑپ نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں عورت کی جدوجہد اور آزادی کے حوالے سے ایک تانیثی نقطہ نظر واضح ہوتا ہے۔

امیر کعب کی وفات رابعہ خضداری پر ذمہ داریوں کا پہاڑ سر پر کھڑا کر دیتی ہے۔ وہ جہاں اپنے والد کے وصال کے بعد پریشان ہے۔ وہاں اس کا بھائی حارث جنگی تیاریوں میں مصروف ہے۔ رابعہ بیکتاش کو خط لکھتی ہے کہ:

"امید ہے کہ تم میری بات کو پا گئے ہو گے میں جنگ صرف امن کے لیے چاہتی ہوں۔ حصول دولت یا اقتدار کے لیے نہیں مجھے بلخ اور خضدار کے آسمان پر خونی ہواؤں کے نشان نظر آ رہے ہیں۔ میرے والد ایک عظیم رہنما تھے۔ انہوں نے حملہ آور بن کر نہیں بلکہ لوگوں کے دلوں کو جیت کر اپنا اثر ورسوخ قائم کیا تھا۔ انہوں نے قبائلی نظام کی ہمیشہ پاسداری کی۔ لوگوں کے طرز زندگی جیسے بھی تھا اس کا احترام کیا۔ مجھے دربار سے اطلاع ملی ہے کہ تخت لاہور کو ابھی روئے زمین اپنے لیے تنگ لگ رہی ہے۔ اس لیے اب دہلی کے میناروں کو مسمار کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ میری رگوں میں بھی عرب کا خون دوڑ رہا ہے۔ لیکن انسان بے شک خسارے میں ہے۔ حارث لاہور کے لیے فوجی دستے تیار کر رہا ہے۔ اس میں بہت سے ایسے نوجوان بھی ہیں جن کو جبراً فوج میں بھرتی کر کے لاہور روانہ ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اس سے بلوچ قبائل کو بہت رنج پہنچے گا تم جانتے ہو کہ بلوچوں کو سنگلاخ پہاڑ ہمیشہ سے اپنے دامن میں پناہ دیتے ہیں۔ جو غیروں کو موت بن کر نگل جاتے ہیں۔

> اس وقت طاقت سے نہیں دانش بندی سے حالات کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے! لیکن یہ بات حارث جیسے لا ابالی ذہن کو سمجھانا بہت مشکل ہے"۔(۱۷)

یہ رابعہ کی سماجی شناخت کی نشان دہی ہے وہ یہاں سماج کو بہتر مستقبل دینا چاہتی ہے۔ امیر کعب جب ایک عشائیے میں اپنے صاحبزادے حارث سے مخاطب ہوتے ہیں کہ:

> "آج رات جشن رکھا ہے اس میں دختر کعب (رابعہ خضداری) بھی ہمارے ساتھ تشریف رکھیں گی"۔(۱۸)

حارث جواباً کہتا ہے کہ والد محترم یہ پردے کے اندر سے بھی تو شریک محفل ہو سکتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرد یا سماج عورت کو چار دیواری تک محدود دیکھنا چاہتے ہیں۔ سماجی حیثیت سے رابعہ امن چاہتی ہیں۔ وہ معاشرے میں نہ مساوی رویے اور حارث کے ظالمانہ رویے سے خائف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ گھوڑے صرف سپاہیوں کے سینے پر دوڑتے ہیں۔ لاشیں ویرانوں میں چیل کوؤں کا ایندھن صرف عام آدمی ہی بنتے ہیں۔ لیکن طاقت کے نشے میں بدمست جھوٹے بادشاہ دور بیٹھے پیغام رسانی کے ذریعے جنگ جاری رکھتے ہیں اور ادھر ہی جنگ کرنے کے حکم نامے بھیجتے رہے ہیں۔(۱۹)

رابعہ سماج میں مساوی حقوق اور امن چاہتی ہیں اور یہی رابعہ کے سماجی عدل و استحکام کو ظاہر کرتا ہے۔

رابعہ خضداری کے عشق کی داستان کی بات کی جائے تو ایسے معاشرے یا سماج میں رابعہ عشق کرتی ہے جہاں عورت کو چار دیواری تک محصور کیا جاتا ہے۔ جہاں نہ تو عشق کرنے کی آزادی ہے اور نہ اس کے اظہار کی۔ رابعہ بیکتاش کو بچانے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھاتی ہے اور اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتی۔ وہ اپنے بھائی کے منصوبے سے باخبر ہوتے ہوئے بھی محل سے دور نکل جاتی ہے اور ان سپاہیوں کو اپنے فن سپاہ گری سے شکست دیتی ہے اور بیکتاش کی جان بچا لیتی ہے۔ بیکتاش شہزادی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک غلام

کے لیے آپ نے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈال دی تو شہزادی یہی جواب دیتی ہے کہ عشق میں ذات پات کا تصور نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے:

"شہزادی آپ نے اپنی جان جو غلام کے لیے داؤ پر لگادی میں اس قابل کہاں۔ شہزادی رابعہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا غلام اور آقا کا تصور دنیاوی مدراج سے نہیں دل کے درجوں سے ہوتا ہے"۔(۲۰)

اسی طرح رابعہ سلطنت کے معاملات میں بھی عقلمندی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اپنے بھائی حارث کو بارہا نصیحت کرتی کہ وہ سلطنت کے معاملات میں دیانتداری کا مظاہرہ کرے اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں نہ کہ غریب اور مزدور طبقے کا استحصال کرے۔ حارث کو یہ بات پسند نہ تھی کہ رابعہ جو کہ ایک عورت ہے اسے سلطنت کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ سلطنت کا جانشین اس کے والد نے اسے مقرر کیا ہے۔ اس بات کا حق سماج عورت کو نہیں دیتا۔ اسی پاداش میں حارث اپنی بہن کی نبض کاٹ دیتا ہے اور رابعہ دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔

قرۃ العین طاہرہ جو کہ جمیلہ ہاشمی کے ناول چہرہ بہ چہرہ روبرو کا ایک سماجی کردار ہے۔ سماج میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ایران میں جتنی بھی تحریکیں چلیں، جن میں شہدائے کربلا کی تحریک، بادشاہ کی اصطلاحات کی تحریک، بابی تحریک اور آخر میں امام خمینی کا ایران انقلاب، ان سب میں عورت کا کردار صفِ اوّل کا رہا ہے۔ بابی تحریک جب شروع ہوئی تو شروع شروع میں لوگ اسے شیطان کی تحریک کہتے تھے اور باطل نظریات کے حامی لوگوں کا گروہ کہتے تھے۔ ہر طرف سے یہی آواز آتی تھی کہ ان کو مار دو، ان کو قتل کر دو، یہ ملک میں فساد برپا کریں گے۔ بادشاہ کے خلاف بغاوت کریں گے اور ملک میں امن وامان کی صورت حال کو خراب کریں گے۔ لیکن جب تحریک چلی تو معاشرے کو پتہ چلا کہ یہ تو ہمارے حقوق کی بات کر رہے ہیں۔ امام مہدی کے ظہور سے قبل یہ اس رستے کو صاف کر رہے ہیں جس میں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ جاگیر دار اور بڑے لوگوں کی حکمرانی ہے۔ عام آدمی اور عورت کو ایک جانور کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے حالانکہ یہ لوگ

بھی معاشرے کا حصّہ تھے۔ اس کے بعد اس تحریک میں جان پڑنا شروع ہوئی۔ قرۃ العین طاہرہ کے سسر جیسا کہ ناول میں لکھا گیا ہے ملا تقی اپنے وقت کے عظیم مذہبی اسکالر تھے اور لوگ دور دور سے ان کا جمعہ کا خطبہ سننے آتے تھے اور کبھی کبھار ایک پرچہ لٹکا کر مجمعے کو بتایا جاتا ہے کہ ان کے حقوق کیا ہیں؟ اور بادشاہ کے حقوق کیا ہیں؟ ہر ایک فرد کو معاشی آزادی ملنی چاہیے اور ہر فرد معاشرے کا ایک اہم رکن ہونے کے ناطے دوسرے فرد کے برابر ہے۔ بادشاہ کی جھوٹی تعریفیں اور یہ کہنا کہ بادشاہ کے اوپر قدرت کا سایہ ہے وہ جو کردے ٹھیک ہے۔ خواہ وہ جھوٹ بولے یا سچ بولے۔ قرۃ العین طاہرہ نے معاشرے میں یہ بات بتائی کہ جھوٹ بولنے والا منصب بادشاہی پر نہیں بیٹھ سکتا، یہ زمانے کا سچ ہے۔ اگر ہم نے ایسے لوگوں کو حکمران بنایا تو ہماری آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی۔ اس کی ہم عمر ملا صالح کی بیٹی جو کہ ایک بلند پایہ شاعرہ تھیں اور نجف کی پڑھی لکھی تھیں۔ وہ بھی اس کے کردار سے متاثر تھیں۔ معاشرے میں قرۃ العین طاہرہ ایران کی ایک پڑھی لکھی خاتون اور رابعہ بصری جیسی صفات کی خاتون تھیں۔ اس وقت کا معاشرہ عورتوں کا آزادانہ مدرسوں میں پڑھنا اور مردوں کے شانہ بشانہ تقاریر کرنا، درباری علما پر تنقید کرنا برداشت نہیں کرتے تھے۔ جمیلہ ہاشمی نے اس تحریک کے ایسے کردار سے پردہ اٹھایا ہے جو نسائی ہونے کے علاوہ متحرک بھی ہے اور معاشرے میں ایک رہنما کا کردار بھی ادا کرتی ہے۔ اس وقت کا معاشرہ اسے پورے معاشرے کی بہن کہتا ہے اور اس کی عزت کرتا ہے۔ کیونکہ بادشاہ کے کارندوں کے سامنے وہ لوگوں کے حقوق کی بات کرتی ہے۔ قرۃ العین طاہرہ انبیائے کرام، اولیائے کرام، بزرگان دین اور اسکالر حضرات کی بڑی قدردان تھیں اور وہ اکثر یہ بات مجمع میں کہتی کہ ہماری دو سو سالہ تاریخ میں جو بزرگوں نے کردار ادا کیا ہے آج ان کے احیا کا وقت آیا ہے تاکہ لوگوں کو ان کے حقوق ملیں جن کے وہ حق دار ہیں۔ اگر ان لوگوں نے اپنے لوگوں کو حقوق نہ دیے تو مغرب والے ان پر آسانی سے قبضہ کرلیں گے جو آزاد ہیں اور آزاد علوم پڑھ رہے ہیں۔ اکثر یونانی کتب جو قرۃ العین طاہرہ نے پڑھ رکھی تھیں ان میں مابعد الطبیعات فلسفہ اور ایسی من گھڑت چیزیں شامل تھیں جن کو وہ ایران کے لیے زہر قاتل سمجھتی تھی۔ لیکن وہ جدید تعلیم کی مخالف نہیں تھی۔ شیخ احمد احسائی اور سید کاظم رشدی جو کہ بابی تحریک کے روح رواں بھی تھے، جب ان سب لوگوں کو قرۃ العین طاہرہ کے چچا ملا تقی کو بھی ایک مسجد کے

اندر شہید کر دیا جاتا ہے تو لوگ کہنے لگے کہ اب بابی تحریک کی باگ ڈور قرۃ العین طاہرہ کو سنبھال لینی چاہیے۔ قرۃ العین طاہرہ جس کو بادشاہ کے کارندوں نے پکڑ کر قید رکھا اور پھر بعد میں اس کی لاش کو ایک اندھے کنویں میں پھینک دیا تاکہ یہ تحریک ختم ہو جائے۔ معاشرے کو اس نے اپنی جان دے کر اپنے معاشرے میں اپنا نام کمایا۔ جب بھی تاریخ میں بابی تحریک کا ذکر آتا ہے تو قرۃ العین طاہرہ کے مرکزی کردار کا ذکر بھی آتا ہے۔ اس کے نام کے بغیر یہ تحریک نامکمل ہے۔ یہ ایک ہمشیرہ کا نسائی کردار ہی ہے کہ جو اس بابی تحریک کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ بابی تحریک امام غائب کے ہونے کا تصور نہیں رکھتی۔ ان کے مطابق ایک وقت میں ایک امام ہر وقت موجود ہوتا ہے جب کہ آخری امام، امام مہدی ہی تشریف لائیں گے تو معاشرے میں امن ہو گا اور کفر کے بادل چھٹ جائیں گے۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے ناولوں میں نسائی کرداروں کی سماجی شناخت کے حوالے سے تاریخ سے وہ کردار ڈھونڈے ہیں جن کی وجہ سے آج بھی یہ تحریکیں زندہ ہیں۔ ایرانی لوگ آج بھی منصور حلاج اور قرۃ العین طاہرہ کو یاد کرتے ہیں کہ یہ لوگ سچے تھے اور وقت کے بادشاہ جھوٹے تھے۔ ان کی مقبولیت میں کمی نہیں ہوئی بلکہ جب تک ایرانی تاریخ زندہ ہے ان کا نام اس میں رہے گا۔ جمیلہ ہاشمی کے اردو ناول ''چہرہ بہ چہرہ روبرو'' میں قرۃ العین طاہرہ کا کردار ایک روشن شمع کی طرح ہے۔

قرۃ العین طاہرہ ایسے معاشرے میں رہتی ہے جہاں عورت کی زندگی گھر تک محدود ہوتی ہے اور عورت کا تعلیم حاصل کرنا یا گھر سے باہر کے امور کو دیکھنا نہایت مایوس سمجھا جاتا ہے لیکن قرۃ العین طاہرہ بہت آزاد طبیعت کی مالک ہے وہ اپنے گھٹن زدہ ماحول سے نکل کر زندگی کو جینا چاہتی ہے۔ کتابوں کا علم حاصل کرتی ہے اور دیگر حقیقتوں سے بھی آشنا ہوتی ہے قرۃ العین طاہرہ شعر کہتی ہے اس کے اشعار رومانی ہیں قرۃ العین ایسی تمام زنجیروں اور پابندیوں کو توڑنا چاہتی ہے جو اسے جکڑ کر رکھنا چاہتی ہیں۔

شاعری کے حوالے سے قرۃ العین طاہرہ کافی شہرت حاصل کر رہی تھی۔ ایسے دور میں کسی بھی عورت کے لیے شاعری کرنا یا شہرت پانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح ان کے مخالفین بڑھتے چلے گئے اور

قرۃ العین طاہرہ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی آزادی نے زندگی کو بہت دشوار بنا دیا لیکن قرۃ العین طاہرہ نے نہایت ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"اُم سلمیٰ جسے ہم قرۃ العین طاہرہ کے نام سے جانتے ہیں، ایسی بے قرار روح کی مالک تھی جس کے پاس دل بھی بڑا تھا اور دماغ بھی۔ جو حق کی تلاش میں ساری عمر سرگرداں رہی اور حق کی تلاش میں ہی جان دے دی"۔(۲۱)

بادشاہ ناصر الدین قرۃ العین طاہرہ کو ملکہ بنانے کا پیغام بھیجتا ہے جس سے وہ انکار کر دیتی ہے اور بالآخر بادشاہ کے حکم پر اسے گلا گھونٹ کر قتل کر دیا جاتا ہے۔

دونوں ناولوں میں کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگیاں اہمیت رکھتی ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے انسان کے اندر کی کشمکش، احساسات اور جذبات کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے۔ مرکزی کردار کی ذہنی کیفیت اور اس کی اندرونی کشمکش کے ذریعے انسانی نفسیات کی گہری تفہیم ملتی ہے۔

ناولوں کا ایک اور اہم پہلو سماجی اور ثقافتی عوامل ہیں جو کرداروں کے افعال اور فیصلوں کو متاثر کرتے ہیں۔ ہاشمی نے یہ دکھایا ہے کہ سماجی دباؤ اور ثقافتی توقعات افراد کی زندگیوں پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔

جمیلہ ہاشمی نے ناول میں عورت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، خاص طور پر اس کی داخلی دنیا، سماجی مقام اور اس کے جذباتی مسائل۔ عورت کے کردار کی پیچیدگی اور اس کی شخصیت کی مختلف جہتوں کو برہنہ کیا گیا ہے۔

ہاشمی کا اسلوب بہت نرگسیت اور پر اثر ہے۔ انہوں نے کرداروں کے اندر کی کیفیت کو زبان کی مدد سے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے، جو کہ ناول کو ایک منفرد رنگ دیتی ہے۔ ان کی زبان اور انداز کا استعمال جملوں کی سادگی اور گہرائی میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

ناول میں انسان کی آزادی، تقدیر، اور اخلاقی فیصلوں کے بارے میں گہرے سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ کرداروں کے تجربات سے یہ سوالات ابھرتے ہیں کہ کیا انسان خود اپنی تقدیر کے فیصلے کر سکتا ہے یا اس پر سماج اور ماحول کا غلبہ ہوتا ہے؟

یہ تمام تجزیاتی عناصر ناول کو ایک پیچیدہ اور فکری سطح پر لے جاتے ہیں، جہاں قاری نہ صرف کرداروں کے جذبات کو سمجھتا ہے بلکہ سماج اور فرد کے مابین تعلقات کو بھی بہتر طور پر دیکھ پاتا ہے۔

ناول می سوزم" حمیرا اشفاق کا ایک مشہور اور اہم ادبی کام ہے جو خواتین کی نفسیات، ان کے جذبات اور سماجی مسائل کو گہرائی سے پیش کرتا ہے۔ اس ناول میں تانیثی پہلو خاص طور پر نمایاں ہے کیونکہ اس میں خواتین کی اندرونی کشمکش، ان کے حقوق کے لیے جدوجہد، اور اُن کی ذاتی آزادی کی خواہش کو اہمیت دی گئی ہے۔

ناول کی مرکزی کرداریں عموماً سماجی رکاوٹوں، معاشرتی دباؤ اور مردانہ اجارہ داری کے تحت زندگی گزار رہی ہوتی ہیں، اور ان کی کہانیوں کے ذریعے یہ دکھایا جاتا ہے کہ کس طرح ایک عورت اپنے حقوق اور ذاتی زندگی کے فیصلے لینے کی آزادی کے لیے لڑتی ہے۔ حمیرا اشفاق نے ناول کے ذریعے نہ صرف عورتوں کی داخلی دنیا کو دکھایا بلکہ ان کے درمیان پائے جانے والے تعلقات، محبت، قربانی اور خودی کے معاملات کو بھی شامل کیا۔

تانیثی نظریے کے تناظر میں یہ ناول اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ خواتین کو ہمیشہ سماج میں اپنی جگہ بنانے اور اپنے احساسات اور خواہشات کا اظہار کرنے کی آزادی کی ضرورت ہے۔ اس میں خواتین کے دکھ، ان کی طاقت اور خود مختاری کی کہانی پیش کی گئی ہے جو تانیثی ادب میں اہمیت رکھتی ہے۔

جمیلہ ہاشمی کی تخلیقات میں تانیثی پہلو واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں، خاص طور پر ان کے ناول چہرہ بہ چہرہ روبرو میں۔ اس ناول میں عورت کے جذبات، اس کی داخلی کشمکش، اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی باریکی سے پیش کیا گیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے عورت کے کردار کو نہ صرف معاشرتی حدود میں بلکہ اس کے اندرونی احساسات اور نفسیاتی کیفیات میں بھی گہرائی سے بیان کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حمیرہاشمی، عورت اور نفسیات مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک، ص ۳۱۲

۲۔ ایضاً، ص ۳۱۴

۳۔ ابو الکلام آزاد، مولانا، مقدمہ مشمولہ مسلمان عورت، لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۰۶ء ص ۱۶

۴۔ ارشاد احمد پنجابی، پنجاب کی عورت۔ حیات و ثقافت، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب ۱۹۷۶ء ص ۱۵۳-۳۰۹

۵۔ رابعہ الرّبا، عورت۔ مصائب، وجوہات، نفسیات، لاہور دعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء ص ۲۸

۶۔ ضیاالدین، پروفیسر، ڈاکٹر، حافظ، سید، قبل از اسلام اور بعد از اسلام، ص ۶۱-۶۳

۷۔ Kishwer Naheed , women myth & realities. Lahore ,sang-e-) meel publications 2008, page:16

۸۔ حمیرہاشمی، عورت اور نفسیات مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک، ص ۲۹۷

۹۔ ضیاالدین، پروفیسر، ڈاکٹر، حافظ، سید، قبل از اسلام اور بعد از اسلام، ص ۴۴۔۵۰

۱۰۔ Herbert Lockyer , all the women of the bible (4th addition) - india, Zondervan publishing house , 2005, p:18

۱۱۔ ضیاالدین، پروفیسر، ڈاکٹر، حافظ، سید، قبل از اسلام اور بعد از اسلام، ص ۵۷

۱۲۔ عابد علی، پروفیسر، ڈاکٹر، عورت قرآن و سنت اور تاریخ کے آئینے میں، لاہور: قرآن منزل، س ن، ص ۳۷

۱۳۔ صبیحہ حفیظ، ڈاکٹر، لوریاں، لوک رسوم، اور سماجی تفریق مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبان حال تک، ص ۲۲۴

۱۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تانیثیت مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن، لاہور: مارچ۔ اپریل، ۲۰۰۷ء، ص ۹

۱۵۔ کشور ناہید، عورت کے خلاف جنگ، مترجمہ شفقت تنویر مرزا۔ مسعود اشعر مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک، ص ۱۳

۱۶۔ کشور ناہید، ڈاکٹر نوال السوداوی، غلاموں کی آزادی مترجمہ شفقت تنویر مرزا مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبان حال تک، ص ۱۳۵-۱۳۶

۱۷۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، می سوزم، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۹

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۴، ۶۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۳

۲۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر "جمیلہ ہاشمی کے دو ناول" معاصر ادب (سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء) ص: ۱۱۶

باب چہارم:

منتخب اردو ناول کے مرکزی نسوانی کرداروں میں ذاتی شناخت کی عکاسی

خواتین کے ہاں تانیثیت

عصمت چغتائی ترقی پسند تحریک کے دور میں مشہور ہوئیں عصمت چغتائی اردو ادب کی بے باک، نڈر، اور جرات مند افسانہ نگار جانی جاتی ہیں۔ اردو ادب میں تانیثی ادب کی باقاعدہ شروعات عصمت چغتائی کے دور سے ہی ہوتی ہے، عصمت چغتائی نے اپنے منفرد اور بے باک موضوعات اور نسائی لب و لہجے کی بدولت ایک الگ راستہ تلاش کیا اور ناولوں کو فن کارانہ جرات آمیز اظہار کا سلیقہ عطا کیا جس کا گہرا اثر ان کی ہم عصر خواتین پر ہوا۔

عصمت چغتائی کے افسانوں کے موضوعات دلچسپ اور عام فہم ہیں۔ ان کی زبان میں رومانیت نہیں جو لڑکیوں کی آنکھوں کو سپنے بننے پر مجبور کرے بلکہ سخت گیری اور اکھڑپن ہے جو انھیں خوابوں کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی تلخ دھوپ میں لا کھڑا کرتی ہے۔ جو زندگی سے آنکھیں ملا کر جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔ عصمت چغتائی نے عورت سے متعلق معاشرتی خیالات اور پختہ روایات کے بت کو توڑا انہیں عورتوں کی زندگی کے تمام مثبت اور منفی پہلوں کی مکمل آگاہی تھی۔

عصمت چغتائی کے بارے میں ڈاکٹر فرزانہ اسلم لکھتی ہیں:

> ”عصمت چغتائی نے عورتوں کی زندگی کے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کی حق تلفیوں اور بے انصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ بے جوڑ شادیوں کے نتائج، ازدواجی زندگی، اور جنسی تعلقات سے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی پیش کیا ہے۔“(۱)

عصمت چغتائی کے افسانے اپنے نسائی شعور اور نسائی لب و لہجے کی بدولت امر ہو گئے وہ نسائیت اور نسوانیت کو ایک دوسرے کے لئے لازم قرار دیتی ہے وہ فیمنیزم کی علم بردار نظر آتی ہیں عورت کے

مقام کو پہچاننا، معاشرے میں اس کی حیثیت کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالنے والی روایات کو سمجھنا اور ان کے خلاف عملی قدم اٹھانا تانیثیت ہے۔

جیلانی بانو کے افسانے سماجی حقیقتوں پر مبنی ہیں، ان کے افسانوں میں ایک ایسی عورت دکھائی دیتی ہے جو نہایت بے بس اور مجبور ہے جو دوسروں کی غلام ہے جس کا کام صرف دوسروں کا حکم ماننا ہے اور دوسروں کے تابع اپنی زندگی گزارنا ہے، جیلانی بانو کے ہاں کسی مخصوص طبقے سے تعلق رکھنے والی عورت کا تصور موجود نہیں بلکہ ان کے ہاں پڑھی لکھی عورت کے بھی مسائل ہیں اور مقتدر طبقے کی عورت بھی معاشرے کے جال میں پھنسی ہوئی ہے، جدھر ان پڑھ عورت مسائل سے دوچار ہے ادھر پڑھی لکھی عورت بھی کسی نہ کسی مسئلے کا شکار نظر آئے گی، اگر ان پڑھ عورت دبی ہوئی زندگی گزار رہی ہے تو پڑھی لکھی عورت بھی معاشرے کی بندیوں میں جکڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے وہ بھی آزاد نہیں ہے ان کی شادی اکثر ایسی جگہ کر دی جاتی ہے جہاں وہ زندگی بھر گھٹن کی زندگی بسر کرتی ہیں، اچھی صورت اور پڑھی لکھی عورتوں کی شادی اکثر لالچ کی بنا پر بڑے زمینداروں کے ساتھ کر دی جاتی ہیں، ایسی شادی بے جوڑ ہوتی ہے اور وہ پوری زندگی اپنی مرضی کے مطابق نہیں گزار سکتی، وہ روز جیتی اور روز مرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورت کے جذباتی اور نفسیاتی المیوں پر کھل کر لکھا گیا ہے، "موم کی مریم، بھنور کے چراغ، آگ کے پھول، ڈریم لینڈ، دیوداسی، روشنی کے مینار وغیرہ مختلف طرح کے نسائی مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ جن میں جیلانی بانو کا نقطۂ نظر اور لب و لہجہ نسائیت کے حوالے سے نظر آتا ہے نذیر احمد جیلانی بانو کے افسانوں کے موضوعات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی جیلانی بانو کے افسانوں کی دو موضوع بنیادی ہیں:

> "(۱) غربت کی حکایت اور (۲) مشرقی عورت کا المیہ۔ بظاہر یہ دونوں ایک دوسرے سے غیر متعلق معلوم ہوتے ہیں لیکن دونوں کا منبع ایک ہے۔ یعنی دونوں کو جنم دینے والا جاگیر دارانہ نظام ہے جس کا نمایاں وصف اقتدار ہے۔ بقول ماوزے تنگ اقتدار چار قسم کا ہے۔ سیاسی اقتدار، مذہبی اقتدار، قبائلی اقتدار اور عورت کا شوہر پر

> اقتدار۔ اس زاویہ نگاہ سے عورت پر مرد کے اقتدار کا تسلط بھی مخصوص اقتصادی نظام کا شاخسانہ ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیلانی بانو نے غربت کی حکایت اور عورت کے المیے کو بیان کر کے جاگیر دارانہ نظام کے نقائص پر تنقید کی ہے۔" (۲)

جیلانی بانو گھریلو الجھنوں کا ذکر کرتی ہیں جو لڑکیوں میں نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا کرتی ہیں جو گھر والوں کے نامناسب رویوں کا بدلہ خود اپنی ذات سے لیتی ہیں خود اذیتی کی یہ مثالیں "جیلانی بانو" کے افسانے "موم کی مریم" میں بڑی سچائی پیش کی گئی ہے۔ جیلانی بانو کے نسوانی کردار صدیوں کے فرسودہ نظام اور معاشرتی جبر و استحصال کا شکار ہیں۔

ڈاکٹر رشید جہاں خواتین افسانہ نگاروں کی پہلی توانا اور مضبوط آواز ہیں "انگارے" شائع کر کے اردو افسانے کی تاریخ میں ڈاکٹر رشید جہاں کا پہلی ترقی پسند خاتون ہونے کی حیثیت سے انکار ممکن نہیں، انھوں نے اپنا تخلیقی سفر جس جرات و بے باکی سے طے کیا اس کے اثرات بعد میں آنے والی خواتین افسانہ نگاروں پر بھی مرتب ہوئے۔ رشید جہاں کے افسانوں میں ہمیں تانیثیت کے موضوع جا بجا دکھائی دیتے ہیں ان کے افسانوں میں وہ خواتین دکھائی دیتی ہیں جو اپنے گھروں میں گھٹن کی سی زندگی بسر کر رہی ہیں ایسے کہنا بجا ہو گا کہ وہ اپنی زندگیاں ضائع کر رہی ہیں ان کے افسانے عورت کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں ان کا افسانہ "آصف جہاں کی بہو" سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں بحوالہ حمیرا اشفاق:

> "ویسے تو کبریٰ بیگم کے ماشاءاللہ ہر سال سوا سال کے پیچھے بچہ ہوتا تھا اور پچیس سال کی عمر میں پانچ بیٹوں کی اماں تھیں۔ سارے کنبے میں ان کی خوش قسمتی ضرب المثل تھی۔ 'خدا نصیبا کرے تو کبریٰ سا جب دیکھو لڑکا ہی گود میں دیکھو اور بیٹی تو بوا خدا دشمن کو بھی نہ دے۔' جب کبریٰ کے ہاں ایک لڑکا ہوتا ساری دنیا رشک کرتی۔ ہاں اگر رنج کسی کو ہوتا تھا تو وہ آصف جہاں تھیں۔ گو وہ کبریٰ بیگم کی صحت یابی سے خوش ضرور ہوتیں تھیں۔ آخر کو جننا اور مرنا برابر ہی

ہے ۔ لیکن پھر بھی جب کبریٰ بیگم کے لڑکا ہوا آصف جہاں روئیں۔ 'اس میں کسی کا کیا قصور ہے میری قسمت ہی خراب ہے۔ نو بچوں میں ایک نور الحسن کا منہ دیکھا ہے اور اس کے لیے بھی میری تمنا پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ جدھر دیکھو بیٹیاں ہی بیٹیاں بھری پڑی ہیں۔ بر تک نہیں جڑتے لیکن میرے بچے کے لیے اللہ میاں دلہن ہی نہیں بھیجتے۔"(۳)

رشید جہاں نے جابجا افسانوں میں ہمیں عورت کے حوالے سے بات کی ہے ان کے نزدیک عورت کی بڑی دشمن عورت ہی ہے جہاں کہیں بھی عورت کا استحصال ہو رہا ہے وہ کسی دوسری عورت کے ہاتھوں سے ہو رہا ہے ان کے بہت سے افسانوں میں دکھائی گیا ہے کہ ایک عورت ہی دوسری عورت پر ظلم کے پہاڑ ڈھا رہی ہے۔ ان کے افسانوں میں ہمیں یہ پیغام ملتا ہے کہ عورت اگر چاہتی ہے کہ معاشرے میں اس کو عزت ملے، معاشرے میں مہذبانہ زندگی گزارے تو اسے اپنے آپ کو تسلیم کرنا ہو گا وہ اپنا احترام خود کرے اور ہمارے معاشرے میں عورت کو اپنے حق کا خود شعور نہیں ہے جس دن اس کو یہ شعور آجائے گا دنیا کی کوئی طاقت اس سے اس کا حق چھین نہیں سکتی۔

بانو قدسیہ نے جب افسانے کی دنیا میں قدم رکھا اور لکھنا شروع کیا تو اس وقت افسانہ اپنی کئی منزلیں اور جہتیں مکمل کر چکا تھا۔ پریم چند، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، غلام عباس، احمد علی، سید رفیق حسین، اور کئی دوسرے افسانے میں اپنا مقام بنا چکے تھے، یہ دور اردو افسانے کا شاندار اور کامیاب ترین دور تھا۔

بانو قدسیہ کے افسانوں میں عورت پڑھی لکھی ہے جو کہ پر اعتماد ہے مردوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں وہ مردوں کے معاشرے میں ان کے قدم سے قدم ملا کر اپنے فرائض کو سرانجام دیتی ہے اور وہ نسوانی قوت جو مردوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، ہمیں اس کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس دیکھیں:

''پہلے پہل جب وہ شیری سے ملا اور وہ اس کے زور دار قہقہے سے چونکا تو اس کا یہی خیال تھا کہ وہ ہرنی کی طرح آزاد قدم، بندر کی طرح بے قرار اور کھٹ بڑھی جیسی خوش مزاج ہے۔ ان دنوں شیری ایک ڈیلی اخبار میں ملازم تھی وہ جمعے کے روز رنگین صفحوں میں شہر کے پریشر گروپ میں سے چیدہ چیدہ لوگوں کے انٹرویو چھاپا کرتی تھی۔ اس ہی سلسلے میں اس کی ملاقات افتخار کے دفتر میں نیلی آنکھوں والی دراز قد شہر زاد داخل ہوئی تھی۔ تو افتخار نے کافی دیر کے بعد اسے یوں دیکھا جیسے وہ کسی چیلنج سے بھرپور پروجیکٹ کی فیز ے بلٹی رپورٹ دیکھا کرتا تھا۔''(۴)

بانو قدسیہ کا معاشرتی زندگی کا بہت گہرا مطالعہ تھاوہ گھروں میں ملازمہ کے واقعات کے بیان کا بہت گہرا شعور رکھتی ہیں بانو قدسیہ کے افسانوں میں جگہ رکھنے والی عورت کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار دکھائی دیتی ہے۔

ممتاز شریں کا پہلا افسانہ جو ''ساقی'' میں چھپا، اُس کا عنوان 'انگڑائی' تھا۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے۔ جو خود نرگسیت کا شکار ہے۔ اور یہی نرگسیت آہستہ آہستہ ہم جنس پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ ہم جنس پرستی اُس دور کا موضوع نہیں تھا، مگر ممتاز شریں نے اس پر قلم اٹھایا۔

ممتاز شریں نے اپنے مجموعے ''اپنی نگریا'' کے بیشتر افسانوں میں ایک ہنستے بستے میاں بیوی کی زندگی کی گھریلو زندگی کو پیش کیاہے۔ ممتاز شریں لکھتی ہیں۔ بحوالہ ابو بکر عباد:

''جب میں نے باقاعدہ لکھنا شروع کیا میری زندگی مسرتوں کی حامل تھی۔ نئ نئ شادی ہوئی تھی۔ نہایت موزوں، مناسب اور ہم ذوق شریک حیات ملے تھے۔ میاں بیوی کی آپس میں محبت اور کامیاب اور خوشگوار ازدواجی زندگی ہی ان دونوں میرے لیے سب سے اہم

حقیقت تھی۔ لہٰذا میرے پہلے مجموعے ''اپنی نگریا'' کے بیشتر افسانے
اس موضوع سے متعلق تھے۔''(۵)

ممتاز شریں نے محض گھریلو شادی شدہ زندگی کو اور آسودہ زندگی کو بیان نہیں کیا بلکہ اس گھریلو زندگی کے جملہ رنگ بھی بیان کئے ہیں۔ انھوں نے شادی شدہ زندگی کی خوبصورتی کو زیادہ احسن انداز میں بیان کیا ہے۔اُنھوں نے اس طرح کے میاں بیوی کے کردار پینٹ کر کے یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے ہم مزاجی کتنی اچھی شئے ہے اور کامیاب زندگی کے لئے کتنی بڑی نعمت ہے۔ انھوں نے اپنے افسانے ''اپنی نگریا'' ایک ایسی میاں بیوی کی کہانی بیان کی ہے جن کے مشاغل الگ الگ ہیں مگر اُن کی محبت میں کسی طرح کمی نہیں آتی۔

رضیہ سجاد ظہیر کے افسانوں کا موضوع خصوصی طور پر متوسط گھرانوں کی روز کی زندگی سے عبارت ہے۔ ان کے افسانوں میں مجبور اور مظلوم عورتوں کی داستان ہے۔ شوہر کی محبت اور توجہ سے محروم عورت ان کے افسانوں کا محور ہوتی ہے۔رضیہ سجاد ظہیر نے عورتوں کی زندگی کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے۔ سماج میں سب سے زیادہ ظلم و ستم کا نشانہ بنائی جانے والی مخلوق صرف عورت ہی ہے، رضیہ نے عورتوں کے دکھوں کو محسوس کیا اور انہیں صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا۔ گھریلو زندگی کے نازک سے نازک مسائل جو بظاہر سیدھے سادے ہوتے ہوئے بھی پیچیدگی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ان کی جیتی جاگتی تصویر رضیہ سجاد ظہیر کے افسانوں میں موجود ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر نے ہمیشہ مظلوم، مجبور اور مصیبت زدہ خواتین کے مسائل کو روح کی گہرائیوں سے محسوس کیا ''نگوڑی چلی آوے ہے'' میں انھوں نے اس مجبور اور مظلوم عورت کو پیش کیا ہے جو اپنا سب کچھ برباد کر کے بھی بھی اپنے شوہر سے محبت کرتی ہیں۔ یہ وہ عورتیں ہوتی ہں جن کی بدولت انسان اور انسانیت کا چراغ روشن نظر آتا ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر کے افسانوں میں ہر طبقے کی عورت کے جذبات کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ اور ان عورتوں کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویروں کی عکاسی کو حقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی کہانیاں میاں

بیوی کے تعلقات تک ہی محدود نہیں رہتیں بلکہ عام طور سے معاشرے میں عورت و مرد کے جو رشتے ہوتے ہیں وہ ان کی کہانیوں میں پائے جاتے ہیں۔

پروفیسر قمر رئیس کے مطابق:

"رضیہ سجاد ظہیر کی کہانیاں بھی ترقی پسند روایت کا ایک حصہ ہیں، سماج میں عورتوں کے انسانی حقوق کی پامالی اور استحصال ان کا خاص موضوع ہے، ان کے ناولوں کی طرح افسانوں میں بھی گہرے سماجی شعور کے ساتھ زبان پر بے پناہ قدرت کا احساس ہوتا ہے، ان کی دردمندی افسانہ میں دیرپا تاثر پیدا کر دیتی ہے۔"(۶)

افسانہ "لنگڑی ممانی" صرف ایک کہانی نہیں بلکہ سماجی بندشوں میں اصول و اقدار کی زنجیروں میں جکڑی ان تمام عورتوں کی کہانی ہے جو خاندانی وقار کی لاج رکھنے کے لیے اپنے جذبات کو قربان کر دیتی ہیں۔

جمیلہ ہاشمی بحیثیت ناول نگار اور افسانہ نگار سنجیدہ ادیب کی صورت میں جگہ بناتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں جابجا تانیثیت کے پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ یہ جذباتیت سے کام نہیں لیتی بلکہ ہر کام عقل سے کرتی ہیں اپنے افسانوں میں وہ ذہین عورت کے بارے میں ایسے اظہار کرتی ہیں:

"ویسے مجموعی طور پر آپ عورتوں کو ذہین نہیں سمجھتے۔ جہاں تک میرا ذاتی سوال ہے، میں بھی اس تعریف سے خاص خوش نہیں ہوتی۔ مرد ذہین عورتوں کو کوئی اچھا مقام نہیں دیتے وہ عورتوں کے ذہن کی تعریف کرتے ہوئے انھیں اس جماعت سے خارج کر دیتے ہیں جو ان کے معاشرے کا نصف سے بھی زیادہ حصہ ہیں۔ ذہین عورتیں مردوں کے پہلو میں کانٹے کی طرح چبھتی ہیں اور جب کانٹے کی خلش سے تنگ آجاتے ہیں تو اسے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔"(۷)

اس کی ذہانت، قابلیت اور ہمت بہادری اس وقت کے ہندوستان کی عورت کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ جمیلہ ہاشمی ہندوستانی عورتوں کے سامنے اسے بطور نمونہ پیش کرنا چاہتی تھیں کہ ایک عورت اتنی باصلاحیت اور ذہین ہو سکتی ہے کہ ہر خطرے کا مقابلہ ہمت سے کر سکے۔

اس معاشرے میں عورت جب فلاح و بہبود کے لئے نکلتی ہے تو اس پر الزام تراشیاں بڑھ جاتی ہیں۔ اس کا ہر فعل قابل رسوائی ٹھہر تا ہے۔ کنول کماری اس ہندوستانی سماج سے شکوہ کناں ہے اور اس پورے نظام پر طنزیہ لہجے میں احتجاج کرتی ہے:

> ”تم عورت کو اس لئے ہی کیوں دیکھتے ہو کہ وہ مرد کے لئے زندہ ہے۔ اس کی اپنی الگ کوئی زندگی کیوں نہیں ہے۔ اس کا اپنا ایک الگ وجود ہے۔ تم اس کو دیکھو گے تو بیٹی کی حیثیت سے بہن بنا کر بیوی اور اماں کی طرح کیا عورت ان حالتوں کے علاوہ ایک عورت نہیں ہے اگر تم ایک مرد بن کر زندہ رہتے اور ترقی کرتے ہو تو کیا عورت رہ کر بہن، بیوی، بیٹی کے رشتوں سے بلند ہو کر نہیں رہ سکتی تم نے اپنی عقل جو پیمانے بنا لیے ہیں انھیں عورت کی شرافت اس کی عزت اور اس کی ہستی کے ناپنے کے لیے کیوں مقرر کرتے ہو۔“(۸)

ناول می سوزم" حمیرا اشفاق کا ایک مشہور اور اہم ادبی کام ہے، جس میں انہوں نے کئی جذباتی اور سماجی مسائل کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے انسانی زندگی کی پیچیدگیوں، جذباتی کشمکش اور موجودہ دور کے مسائل کو گہرائی سے پیش کیا ہے۔ اس کی کہانی میں کرداروں کی اندرونی دنیا اور ان کی حالتِ زار کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔

حمیرا اشفاق ایک پاکستانی مصنفہ اور ناول نگار ہیں جن کا کام عام طور پر انسانی جذبات، معاشرتی مسائل، اور پیچیدہ نفسیات کے گرد گھومتا ہے۔ ان کی تحریریں عموماً فرد کے اندرونی تضادات، ذاتی جدوجہد اور سماجی اصولوں کے درمیان کشمکش کو اجاگر کرتی ہیں۔

"ناول می سوزم" میں بھی یہ خصوصیات نمایاں ہیں، جہاں حمیرا اشفاق نے ایک گہرے نفسیاتی تجزیے کے ساتھ کرداروں کی شخصیتوں اور ان کے اندر کی پیچیدگیوں کو سامنے لایا ہے۔ ان کے کردار عموماً داخلی کشمکش، محبت اور نفرت کے جذبات، اور فرد کی شناخت کے سوالات کے گرد محوِ فکر ہوتے ہیں۔

حمیرا اشفاق کی فکری خصوصیات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ سماجی ناہمواریوں اور طبقاتی فرق کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔ ان کا اسلوب شاعرانہ اور فلسفیانہ ہے اور وہ اکثر انسانی حالتوں کو ایک فلسفیانہ نظر سے دیکھتی ہیں۔ ان کے کردار صرف مادی دنیا میں نہیں بلکہ داخلی، جذباتی اور فکری سطح پر بھی لڑ رہے ہوتے ہیں۔

"چہرہ بہ چہرہ" جمیلہ ہاشمی کا ایک معروف ناول ہے جو پاکستانی ادب میں اہمیت رکھتا ہے۔ اس ناول کی کہانی انسانوں کے پیچیدہ جذبات، تعلقات، اور سوشل مسئلوں کو گہرائی سے بیان کرتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اس ناول میں ایک ایسے دور کو اجاگر کیا ہے جہاں انسانوں کے درمیان رشتہ اور سماجی تقاضے آپس میں ٹوٹتے ہیں اور کبھی کبھی انسان اپنے ہی آپ سے دور ہو جاتا ہے۔

اس میں مختلف کرداروں کے ذریعے انسانی نفسیات اور معاشرتی دباؤ کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس ناول میں لذت اور دکھ کی ایک عجیب و غریب کشمکش نظر آتی ہے، جہاں ہر کردار اپنے وجود کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی زبان کی سادگی اور گہرائی اسے ایک طاقتور اور جذباتی اثرات رکھنے والا کام بناتی ہے۔

ناول چہرہ بہ چہرہ" جمیلہ ہاشمی کا ایک اہم اور مشہور ناول ہے جس میں بہت سی فکری خصوصیات نظر آتی ہیں۔ اس ناول میں جمیلہ ہاشمی نے انسان کے داخلی جذبات، ذہنی کشمکش، اور معاشرتی تعلقات کو بہت باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ اس ناول میں ان کے فکر کی گہرائی اور زندگی کی پیچیدگیوں کا عکاس ملتا ہے۔

ناول "می سوزم" اور "چہرہ بہ چہرہ روبرو" ایک گہرا اور پیچیدہ تصور ہے جس میں مختلف تجزیاتی عناصر شامل ہو سکتے ہیں۔ اس جملے میں "می سوزم" ایک داخلی احساس یا جذبہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے،

جو کہ انسان کے دل یا دماغ کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ "چہرہ بہ چہرہ روبرو" ایک بیرونی منظر یا تعلق کو ظاہر کرتا ہے جہاں دو افراد ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں۔

اگر اس جملے کو تجزیہ کیا جائے، تو یہ ممکنہ طور پر انسان کے داخلی کشمکش اور اس کے خارجی روابط کے بیچ کی کشمکش کی عکاسی کرتا ہے۔ "می سوزم" وہ داخلی درد یا جذباتی الجھن ہو سکتی ہے جو کسی شخص کو ایک دوسرے سے روبرو ہونے پر محسوس ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جذبات کسی تناؤ، محبت، یا ملال کی صورت میں ہوں۔

جذبے اور احساسات کا تضاد: "می سوزم" ایک داخلی درد کی علامت ہو سکتا ہے، جو کسی بیرونی تعلق یا ملاقات سے جڑا ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ دو افراد ایک دوسرے کے سامنے ہیں، جو ممکنہ طور پر کسی چیلنج یا فیصلے کے لمحے کو ظاہر کرتا ہے۔

جب دو افراد ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں، تو ان کے بیچ کی کشمکش، سمجھوتے یا تعامل کی نوعیت اہم ہو جاتی ہے۔ رابعہ خضداری ایسی شاعرہ ہے جو رودکی کے دور کی شاعرہ ہے۔ رودکی کو فارسی شاعری کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس شاعرہ کو زین العرب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کے معنی عربوں کا حسن کے ہیں۔

خاتون شاہ بانو ایک دن باغ بہشت میں شام کو محل کے اندر شاعری کی محفل کا انتظام کرتی ہے۔ رات کو چمن اپنی پوری تابانی پر تھا۔ خواتین نے اپنا تازہ کلام سنایا رابعہ جو کہ عروض سے پوری طرح واقف تھی پہلے اس نے لڑکیوں کا کلام غور سے سُنا۔ پھر ان کو ٹوکا کہ یہ کیا ہوا غزل میں بحر کا خیال کیوں نہیں رکھ رہی ہیں۔ قندھار سے آئی ہوئی ایک شاعرہ کا بڑا شہرہ تھا۔ اسی محفل میں مشہور شاعر روش دل خضداری بھی موجود تھے۔ بعض عورتوں نے مرد شاعر کی موجودگی کو بُرا مانا۔ لیکن رابعہ نے کہا کہ شاعر لوگ بے ضرر ہوتے ہیں۔ روش دل خضداری نے رابطہ کار کا شکر ادا کیا۔ رابطہ کار نے روش دل خضداری کو کہا کہ آپ کے کلام کی شہرت آپ کو یہاں لے آئی ہے۔ خضداری نے کہا کہ میں کلام تو ضرور پیش کروں گا لیکن ایک عرض ہے کہ محفل کا کچھ رنگ سخن مجھ سے متعارف کروالیا جائے تو موزوں کلام کا انتخاب کر سکتا ہوں۔ گل بانو نے سارنگی تھامے کچھ پیش کیا۔ بعد ازاں سب خواتین نے اپنا کلام پیش کیا۔ روش دل خضداری نے شعر کی مناسبت سے ہر شعر کے ٹکڑے پیش کیے۔ گل بانو کی بانسری نے محفل میں شعر کو چار چاند لگادیے آخر میں رابطہ نے کہا:

کتنا زیادہ خون میرے دل میں جمع ہو گیا ہے
مگر دل سے گل لالہ رنگ لے گیا ہے
اس کی یاد میں آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا ہے
میرا پورا جسم سیلاب کی مانند بن گیا ہے
چونکہ میں نے تیرے چہرے کی ہریالی دیکھی ہے(۹)

روش دل خضداری اور رابعہ خضداری کے کلام کے دوران خوب است، خوب است کے نعرے لگے۔ بلخ کے نمائندہ شاعر رود کی جب محفل میں شاعری کی نشست میں آتے ہیں تو محفل موسیقی اور شاعری کے بعد حارث ابن کعب تلوار بازی کا مقابلہ کرنے کے لیے بیکتاش اور سالم کو میدان میں اتارتے ہیں جس سے سالم بیکتاش کے وار سے زخمی ہو جاتا ہے۔ پس پردہ موجود خواتین میں امام خاتون یہ دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہیں۔

رابعہ خضداری امام خاتون کی عیادت کے لیے ان کے کمرے میں تشریف لاتی ہے۔ ان کا جذبہ احترام اور دوسری خواتین کو ان ظاہر کرتا ہے۔ جب ان کا ہاتھ سہلاتی ہے اور پوچھتی ہیں کہ آپ نے تو بڑے بڑے معرکے دیکھے ہیں۔ اب یہ معمولی معرکہ دیکھ کر آپ بے ہوش کیوں ہو گئیں۔

بیکتاش اپنے اس جرم کا کفارہ ادا کرنے کے لیے رابعہ کو خط لکھتا ہے۔

محترم اور پاکیزہ رابعہ !!

ایک سوال پوچھنے کی جسارت کر رہا ہوں اُمید ہے کہ آپ کا غنی دل اس ادنٰی غلام کو درگزر فرما دے گا۔ میں اپنے باطن میں چھپے کچھ سوالوں کو الفاظ کا جامہ شاید آپ کی طرح نہ پہنا سکوں۔ دوسری بات یہ کہ میں اپنی طاقت جس پر مجھے ایک عرصہ تک گھمنڈ تھا اب میں اسے اپنی کمزوری سمجھنے لگا ہوں۔ کیا کسی کمزور پر زور آزمائی بہادری ہو سکتی ہے؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں تو پھر میری تلوار نے محض طاقت کے زعم میں کئی اپنے سے کمزوروں کو زندگی سے موت کی طرف دھکیل دیا ہے۔ یہ ندامت مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتی۔ کیا اس خون بہا کا کوئی کفارہ ہو سکتا ہے؟ کیا اس بیکتاش میں کوئی دوسرا بیکتاش چھپا بیٹھا تھا جس نے میرے وجود میں بغاوت کر دی ہے"۔

محض سکون قلب کا طالب

ایک ادنیٰ غلام بیکتاش (۱۰)

خط کئی بار پڑھنے کے بعد شہزادی رابعہ رعنا سے کہتی ہے:

"رعنا! ایک طاقتور تلوار باز کا دل اس قدر حساس بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ مکتوب سے ظاہر ہے" رابعہ اور رعنا کے درمیان یہ گفتگو ہی ظاہر کرتی ہے کہ عورت ہی عورت کو ہم راز بنا سکتی ہے اور ایک حساس مرد ہی عورت کے دل میں گھر کر سکتا ہے"۔(۱۱)

رابعہ کی پاکیزہ محبت اور اس میں بیکتاش کے لیے روشن ہوتی چنگاری بیکتاش کے حساس دل کا کرشمہ ہے۔

رابعہ خضداری کی طرف سے لکھا گیا ایک مختصر سا محبت نامہ ملاحظہ ہو جس میں رابعہ خضداری کی محبت کو ایک مختصر پیرائے میں بیان کر رہا ہے۔

بیکتاش کی زندگی میں محبت ایک نعمت کی طرح نازل ہوتی ہے یہ گداز اسی کا شاخسانہ ہے محبت کے بڑے وسیع معنی ہیں مخلوق سے عشق کرو، اس کے حال کے محرم بنو، ان کے درد کی دوا بنو"۔ رابعہ نے رعنا کے سامنے اعتراف کرنے کے انداز میں کہا:

"حارث کی بدسلوکی نے میرے اندر اس کے خلاف نفرت بھر دی ہے"۔ (۱۲)

رابعہ ایک عورت سے اور بدسلوکی اسے برداشت نہیں۔ یہاں تک کہ اپنے بھائی حارث کی بھی بدسلوکی اس کے دل میں نفرت بھر رہی ہے۔ رعنا کے ہاتھ ایک خفیہ مکتوب میں ایک قاصد کے ہاتھوں رابعہ تک پہنچتا ہے تو اس سے پہلی بار خوف محسوس ہوتا ہے

"قیدی رنگین پنجروں میں بھی قیدی ہوتا ہے"۔(۱۳)

یہاں رابعہ اپنی ذاتی اور شخصی تنہائی کو بیان کر رہی ہے کہ اتنے وسیع رقبے پر پھیلی حکومت میں وہ کس قدر قید ہے اتنے خوبصورت محلات میں رہنے کے باوجود وہ قید میں میری زندگی محسوس کر رہی ہے۔

سماجی حیثیت سے رابعہ امن چاہتی ہیں وہ معاشرے میں نامساوی رویے اور حارث کے ظالمانہ رویے سے خائف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ گھوڑے سپاہیوں کے سینے پر دوڑتے ہیں۔ لاشیں ویرانوں میں چیل کوؤں کا ایندھن صرف عام آدمی بنتے ہیں لیکن طاقت کے نشے میں بدمست جھوٹے بادشاہ دور بیٹھے پیغام رسانی کے ذریعے جنگ جاری رکھتے ہیں اور ادھر ہی جنگ کرنے کے حکم نامے بھیجتے رہے ہیں۔

رابعہ سماج میں مساوی حقوق اور امن چاہتی ہیں اور یہی رابعہ کے سماجی عدل واستحکام کو ظاہر کرتا ہے۔ ذات میں رابعہ خضداری خدا کی وحدانیت اور روحانیت کے جذبے سے سرشار ہے۔ جب رعنا سے بات ہو رہی ہوتی تو اس کے سوچنے کا زاویہ اس کی ذات میں باطن کا پتا دیتی ہے۔

> "رابعہ کی ذات میں سوائے رب اور رعنا کے علاوہ کوئی نہیں وہ بیکتاش سے خطوط کے تبادلے کے بارے میں محتاط ہے۔ وہ محبت کے راز آشکار کرنے کی قائل نہیں اس لیے وہ چاہتی ہیں اور رب سے دعا کرتی ہیں کہ میرا راز محبت بیکتاش پر کبھی ظاہر نہ ہو"۔(۱۴)

رابعہ کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں۔ سماجی حیثیت میں وہ تمام عالم کی انسانیت کو مقدم رکھتی ہے۔ وہ ذات پات، بادشاہ، غلام سے انسان کو ماورا سمجھتی ہے۔ وہ اپنے مذہب کو بہترین کرنے کی بات کرتی ہے۔ رابعہ کا بیکتاش تاج کو لکھا ہوا خط قابل توجہ ہے۔

زنان خانے میں حارث کی ملاقات اس کی بہن یعنی رابعہ شہزادی سے ہوتی ہے تو وہ جبری بھرتی کیے گئے سپاہی کی رہائی کا مطالبہ کرتی ہے تو حارث اس کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے کیونکہ امام خاتون کی موت کے وقت رابعہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سالم خان کی رہائی کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گی اس لیے اس

نے حارث سے استفسار کیا لیکن حسب توقع حارث اس بات سے راضی نہ ہوا اور رابعہ کو کہا کہ کسی نے تم کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

رابعہ خضداری بطور عورت ذات بہت سے فنون سے واقف ہوتی ہے۔ بطور عورت عرب معاشرے اور بلوچی معاشرے سے بھی واقف ہوتی ہے۔ اس کی تہذیب روایات سے آشنا ہوتی ہے۔ رابعہ خضداری سپہ گری جیسا فن بھی جانتی ہے۔ رابعہ بیکتاش کو بچانے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھاتی ہے اور اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتی وہ اپنے بھائی کے منصوبے سے باخبر ہوتے ہوئے بھی محل سے دور نکل جاتی ہے اور ان سپاہیوں کو اپنے فن سپاہ گری سے شکست دیتی ہے اور بیکتاش کی جان بچا لیتی ہے۔

بطور عورت رابعہ خضداری عاشق کے رول میں بھی نظر آتی ہیں جسے ایک غلام اور ان کی فوج کے سپہ سالار بیکتاش سے عشق ہو جاتا ہے رابعہ خضداری کے لیے ذات پات وغیرہ اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ بیکتاش کی محبت میں اپنے بھائی حارث کے سامنے بھی ڈٹ کر کھڑی نظر آتی ہے۔ بیکتاش کی جان خطرے میں ہوتی ہے تو شہزادی اپنے فن سپاہ گری سے سپاہیوں کو شکست دیتی ہے اور بیکتاش کی جان بچا کر وہاں سے لے جاتی ہے جس پر بیکتاش کو حیرت بھی ہوتی ہے کہ شہزادی اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچانے کے لیے آئی ہے۔ رابعہ خضداری دیگر علوم کے ساتھ ساتھ انسانیت کا درد بھی رکھتی تھی۔ رابعہ نے اپنی شاعری اور دانشمندی کی وجہ سے بہت شہرت پائی۔ دانشمندوں کی محفلوں میں بھی رابعہ کی تعریفیں کی جاتی تھیں۔ ریاست کے معاملات میں بھی رابعہ نہایت رازداری سے نظر رکھتی تھی اور مسائل کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی نظر آتی تھی جو کہ اس معاشرے کی عورت کے لیے قطعی درست نہیں سمجھا جاتا تھا۔

بطور بیٹی رابعہ خضداری نے باپ امیر کعب کی زندگی میں بھی والد کے احکامات کا خیال کیا اور مرنے کے بعد بھی بھائی جو کہ اقتدار کے نشے میں دھت تھا کو والد کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایات دیتی رہی مگر وہ باز نہ آیا۔ اس نے ہر طرف لوٹ مار مچا رکھی تھی جو کہ رابعہ خضداری سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ تب بھی رابعہ نے بیکتاش جو کہ جنگجو تھا اسے ریاست کے معاملات کی خبر رکھنے کا حکم دیا اور بیکتاش نے حکم کی تکمیل کرتے

ہوئے تمام راز رابعہ کے سامنے رکھ دیے۔ دیکھا جائے تو رابعہ نے بطور بیٹی، بہن، عاشق اور بطور معاشرے کی فرد کے بلاخوف وخطر تمام فرائض بخوبی انجام دیے۔

"چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" کے مرکزی نسوانی کرداروں میں ذاتی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ: قرۃ العین طاہرہ کے حوالے سے دیکھا جائے تو "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" میں مرکزی نسائی کردار قرۃ العین طاہرہ کی ذات اپنے آپ میں ایک علم کی انجمن ہے۔ فلسفہ کی ماہر ہے۔ تاریخ اور مذہب کو پڑھنا اس کا خاندانی پیشہ ہے۔ لوگ ان کو ملا کا خاندان کہا کرتے تھے اور علاقے میں اس خاندان کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پورے ناول میں قرۃ العین طاہرہ کا کردار اپنی مثال آپ ہے۔ ناول میں یہ نسائی کردار انسانوں کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے سامنے آتا ہے۔ مردوں کے شانہ بشانہ ایک نسائی کردار مردوں اور عورتوں دونوں کے حقوق کی بات کرتا ہے۔ وہ اکثر یہ کہتی ہے کہ ہماری تاریخ میں عورتوں پر ہونے والے مظالم عام آدمی کے حقوق، بادشاہوں کا بے جا اسراف، اس کا مذہب کو استعمال کرنا ایرانی تاریخ کو مسخ کرنا مشغلہ بن چکا ہے بلکہ ہمارے لیے مشعل راہ حضرت علیؓ اور اہل بیت ہیں جنھوں نے کربلا کے میدان میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور یزید کے دربار میں اسے جھوٹا کہا جو کہ اپنے آپ کو سچا کہتا تھا۔ یہ حضرت زینبؓ کا ایک نسائی کردار ہی تھا جس نے بھرے مجمع میں یزید کو جھوٹا کہا۔ قرۃ العین طاہرہ کا یہ کہنا ہے کہ ہمیں یہاں سے ہی ہدایت کی روشنی ملتی ہے جو ہم میں استقامت پیدا کرتی ہے۔ حوصلے کے لحاظ سے عورتیں مردوں سے زیادہ مضبوط ہیں۔ قرۃ العین طاہرہ کے بابی تحریک میں شامل ہونے سے پہلے یہ تحریک اتنی جاندار نہیں تھی۔ ان کے شامل ہونے کے بعد قرۃ العین طاہرہ کی دن رات کی محنت اور مشہور اسکالر کاظم رشدی سے خط و کتابت کی بحث اور عام ملاؤں سے مذہبی مناظرہ کرنا، عام لوگوں کے حقوق کی بات کرنا قرۃ العین طاہرہ کا اہم مشغلہ تھا۔ اُس زمانے کے لحاظ سے قرۃ العین طاہرہ کی شادی بھی اس کے چچازاد ملا محمد سے کم سنی میں کر دی گئی۔ اُس کے باوجود بھی اس نے اپنی تعلیم کو مکمل کیا اور بابی تحریک کا حصّہ رہی۔ وہ اکثر جب کسی سے ناراض ہوتی تو اپنے آپ کو ایک کمرے میں قید کر لیتی تھی اور اکثر مراقبے میں چلی جاتی تھی۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ کبھی وہ سوچتی کہ کاش بنو اُمیہ نے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں کربلا جیسا ظلم نہ کیا ہوتا تو آج ہماری تاریخ مختلف ہوتی۔

بابی لوگ زیادہ تر امام جعفر صادقؑ کے مقلد تھے اور اپنی تحریک میں انھی کے مذہب کا پرچار کرتے تھے۔ ذات کے لحاظ سے بابی تحریک میں قرۃ العین طاہرہ کا کردار نہایت اہم ہے۔ جب قرۃ العین طاہرہ نے خطوط کے ذریعے اپنے انقلابی بھائی بہنوں کو یہ پیغام دیا، جو کہ شہر شہر میں بابی تحریک کے لیے کام کر رہے تھے کہ بادشاہت ہی ہماری ترقی کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ بابی تحریک کے انقلابی لوگوں کو یہ باور کرواتے کہ قرۃ العین طاہرہ نے بادشاہ کو جھوٹا کہا ہے اور امام کو سچا کہا ہے۔ بادشاہ امام کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ جو یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم امام ہیں۔ امام کی تعریف میں قرۃ العین طاہرہ نے کئی خطوط لکھے جس میں امام کے اوصاف اس کی صاف دلی، رعایا پروری اور لوگوں کے حقوق کا خیال رکھنا اولین ترجیح قرار پاتا ہے۔ لیکن بادشاہ ان تمام صفات سے محروم ہیں اور ایک ظالم اور جابر انسان ہے۔ وقت کے بادشاہ نے سب اس تحریک کو کفر کا فتویٰ دلوایا، اس کے بعد ایک ایک کارکن کو تہ تیغ کر دیا۔ بادشاہ کے مشیر اسے یہ مشورہ دیتے تھے کہ اگر یہ تحریک کامیاب ہو گئی تو لوگ بڑے بڑے لوگوں اور بادشاہ کو قتل کر دیں گے اور اس کی حکومت آجائے گی جو اہل ایران کے لیے زہر قاتل ہے۔ اس تمام تحریک میں قرۃ العین طاہرہ ہی تھی جو آخر میں شہید کی گئیں اور ان کی شہادت کے بعد بابی تحریک کا زور ختم ہو گیا۔ بابی تحریک جسے انیسویں صدی کے اوائل میں ایک مذہبی عالم احمد احسائی نے شروع کیا تھا۔ ابتدا میں یہ تحریک بادشاہت اور بادشاہ کی ناانصافیوں کے خلاف تھی جوں جوں نوجوانان وقت اس میں شامل ہوتے گئے اور اس میں شدت آتی گئی۔ ان کا مرکزی فلسفہ اشتراکیت سے ملتا جلتا تھا۔ قرۃ العین طاہرہ اپنے خطوط میں تمام ملکی جائیداد کو مشترکہ ملکیت تصور کرتی تھی۔ بڑے آدمی اور عام آدمی کی محنت کو معاشرے میں مساوایات کی بات کرتی تھی۔ ایرانی معاشرے میں بادشاہ کو بہت زیادہ پذیرائی حاصل تھی۔ اس تحریک کی وجہ سے بادشاہت کمزور پڑنا شروع ہوئی۔ ایران کے اس وقت کے قاچاری بادشاہ نے اس وقت کے بابی تحریک کے رہنما سید محمد علی باب جو کہ امام مہدی کے بہاؤ اللہ ہی بنے تھے، کو قتل کر دیا اور ساتھ ساتھ اس تحریک کے جو بڑے لوگ تھے وہ بھاگ کر سلطنت عثمانیہ ترکی چلے گئے۔ لیکن قرۃ العین طاہرہ ایران میں رہ کر تحریک کی قیادت کرتی رہیں۔ اس نے اپنی جان سچ کی خاطر دی جب کہ بڑے بڑے

لوگ ترک بھاگ گئے تھے۔ یہ نسائی کردار اپنی ذاتی شناخت کے حوالے سے ایک جذبہ حریت کا کردار ہے جو عام آدمی کے لیے لڑتا ہے۔

قرۃ العین طاہرہ ایسے معاشرے میں رہتی ہے جہاں عورت کی زندگی گھر تک محدود ہوتی ہے اور عورت کا تعلیم حاصل کرنا یا گھر سے باہر کے امور کو دیکھنا نہایت مایوس سمجھا جاتا ہے لیکن قرۃ العین طاہرہ بہت آزاد طبیعت کی مالک ہے وہ اپنے گھٹن زدہ ماحول سے نکل کر زندگی کو جینا چاہتی ہے وہ کتابوں کا علم حاصل کرتی ہے اور دیگر حقیقتوں سے بھی آشنا ہوتی ہے قرۃ العین طاہرہ شعر کہتی ہے اس کے اشعار رومانی ہیں قرۃ العین ایسی تمام زنجیروں اور پابندیوں کو توڑنا چاہتی ہے جو اسے جکڑ کر رکھنا چاہتی ہیں۔

شاعری کے حوالے سے قرۃ العین طاہرہ کافی شہرت حاصل کر رہی تھی۔ ایسے دور میں کسی بھی عورت کے لیے شاعری کرنا یا شہرت پانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح ان کے مخالفین بڑھتے چلے گئے اور قرۃ العین طاہرہ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی آزادی نے زندگی کو بہت دشوار بنا دیا لیکن قرۃ العین طاہرہ نے نہایت ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> "اُم سلمیٰ جسے ہم قرۃ العین طاہرہ کے نام سے جانتے ہیں، ایسی بے قرار روح کی مالک تھی جس کے پاس دل بھی بڑا تھا اور دماغ بھی۔ جو حق کی تلاش میں ساری عمر سرگرداں رہی اور حق کی تلاش میں ہی جان دے دی"۔(۱۵)

بادشاہ ناصر الدین قرۃ العین طاہرہ کو ملکہ بنانے کا پیغام بھیجتا ہے جس سے وہ انکار کر دیتی ہے اور بالآخر بادشاہ کے حکم پر اسے گلا گھونٹ کر قتل کر دیا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فرزانہ اسلم: 'عصمت چغتائی، بحیثیت ناول نگار'، پٹنہ، ۱۹۹۴ء، س۹۵

۲۔ نذیر احمد: 'جیلانی بانو کی افسانہ نگاری'، مشمولہ، 'الفاظ'، شمارہ جون ۱۹۸۴ء، مدیر جمیل اختر، ص۱۹

۳۔ حمیرا اشفاق (مرتبہ) ''نثر رشید جہاں'' سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء، ص۲۵

۴۔ بانو قدسیہ ''دوسرا دروازہ'' سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۴۵

۵۔ ابو بکر عباد ''ممتاز شریں'': ناقد اور کہانیاں، ص۸۳

۶۔ قمر رئیس: آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ، ص۱۷

۷۔ جمیلہ ہاشمی، تلاش بہاراں، دوسرا ایڈیشن، لاہور ۱۹۶۲ء ص۱۴

۸۔ جمیلہ ہاشمی، تلاش بہاراں، دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۲ء ص۱۹۶

۹۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، می سوزم، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۱۲۲

۱۰۔ ایضاً، ص۴۳

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً، ص۱۰۱

۱۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، "جمیلہ ہاشمی کے دو ناول" معاصر ادب (سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء) ص:۱۱۶

ماحصل

مقالے کا موضوع اُردو کے دوناولوں کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے جس کے تحت اردو کے دو ناول نگاروں جمیلہ ہاشمی اور حمیرا اشفاق کے ناول "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو" اور "می سوزم" میں عورت کے کردار کا جائزہ لینا ہے۔ مجوزہ تحقیقی موضوع کے تحت مذکورہ دونوں ناولوں کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ کرنا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ناول "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو" کا مرکزی کردار قرۃالعین طاہرہ ہے جو ایران کی تاریخی شخصیت اور بہائی تحریک کی اہم رکن تھیں۔ جبکہ ناول "می سوزم" کا مرکزی کردار رابعہ خضداری ہے جو فارسی کی معروف شاعرہ ہیں۔ جمیلہ ہاشمی اور حمیرا اشفاق نے مرد معاشرہ(Male Dominated society) میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور امتیازات کو موضوع بنایا ہے۔ دونوں خواتین مصنفین کے مطابق ہمارے معاشرے میں ہر شعبہ زندگی میں مرد کو ہی امتیازی اہمیت حاصل ہوتی ہے حتیٰ کہ خواتین کے نام بھی پہلے باپ اور پھر شادی کے بعد شوہر سے منسوب ہوتے ہیں اور مرد نے ہمیشہ عورت کو ماتحت بناکر رکھا ہے۔ بھلے وہ ماں، بہن، بیٹی یابیوی کے روپ میں ہے۔ عورت کی اپنی ذاتی شناخت قائم نہیں ہوئی وہ ہمیشہ مرد کی محتاج رہی ہے اور اسی چیز نے اسے مکمل شخصیت نہیں بننے دیا۔ ان دوناولوں میں تانیثی حوالے سے مطالعہ اور تجزیہ کیا گیا ہے۔ ناولوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مذکورہ مصنفین نے اس موضوع کے ساتھ کس حد تک نباہ کیا ہے۔

یہ موضوع اردو کے ناول "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو" اور "می سوزم" کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو کے ان دونوں ناولوں کے مرکزی نسوانی کرداروں کی شناخت کا تجزیاتی مطالعہ کر کے عورت کے کردار، اس کی سوچ اور فکر کو کس طریقے سے نمایاں کیا گیا ہے۔

فیمینزم یا تانیثیت اس احساس کا نام ہے کہ معاشرے میں عورت مظلوم ہے اور مختلف طریقوں سے ظلم و جبر کا شکار ہے۔ اس کے تحت ایلن شوالٹر کی پیش کردہ تانیثی تھیوری کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ تانیثیت عربی زبان کا لفظ ہے۔ تانیثیت کو انگریزی میں Feminism کہا جاتا ہے۔ یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ جس کو اصطلاح

میں Femina کا مترادف کہا جاتا ہے۔ تانیثیت کو تحریکِ نسواں، نظریہ نسواں، حقوقِ نسواں اور نسوانیت کہا جاتا ہے۔ تانیثیت سے مراد عورتوں کے جذبات، احساسات، مشاہدات، رجحانات اور مسائل کی ترجمانی ہے۔ تانیثیت کی تحریک مردوں کی بالادستی، اور ان کے ظلم و جبر استحصال، عورتوں کی حق تلفیوں کے خلاف رد عمل کے طور پر مغربی ممالک میں ابھر کر سامنے آئی اور رفتہ رفتہ مشرقی ممالک میں پھیلتی چلی گئی۔ اس تحریک کا آغاز ۱۹۸۱ء میں فرنچ میڈیکل ٹکسٹ میں لفظ فیمنسٹ نسوانیت والے مردوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ البتہ مغرب میں یہ تحریک، آزادی نسواں کے حامیوں کو بھی کہا گیا ہے۔ بعد میں لفظ فیمینزم تحریک نسواں اس کی اصطلاح بن گئی۔ ایلین شوالٹر نے تانیثیت کو نظریے کی صورت فراہم کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اس کی کوشش تانیثی تھیوری کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یعنی ایلین شوالٹر نے انتقاد نسواں (Gynocriticism) کی بنیاد رکھی۔ موضوع میں عورت کی سماجی، صنفی، اور ذاتی شناخت کا تنقیدی مطالعہ (ایلین شوالٹر کی تانیثی تھیوری کے تناظر میں) شوالٹر کی کتاب "Literature of Their own" جو کہ ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی کیا گیا ہے۔

جمیلہ ہاشمی اور حمیرا اشفاق نے اپنے ناول میں ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کی ہے جہاں پر مردوں کی اجارہ داری ہے۔ عورت پستی کا شکار ہے۔ انہوں نے اس سماج میں پھیلی جہالت، توہمات پرستی اور غلط رسم و رواج کی بھینٹ چڑھی عورت کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں معاشرتی و سماجی برائیوں کی نشاندہی کی ہے۔

عورت کے تاریخی تصور کو دیکھا جائے تو مخالف جنس کے برعکس نظر آتا ہے۔ عورت اپنے آپ کو منوانے کے لیے جہدِ مسلسل سے گزرتی ہے۔ قدیم دور میں بھی عورت مرد کے لیے ہر طرح سے مدد گار نظر آتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اولاد کو بھی جنم دیتی ہے اور اپنے اُمور خانہ سے بھی کسی قسم کی بھی غفلت برتتی نظر نہیں آتی تھی۔ بعض تہذیبوں میں اسی بنا کر عورت کی پرستش بھی کی جانے لگی۔

ڈاکٹر حمیرا اشفاق کی پہچان استاد، محقق، دانشور، نقاد، افسانہ نگار اور اب "می سوزم" کی اشاعت کے بعد ناول نگار کے طور پر ہوتی ہے۔ ان کا یہ پہلا ناول "می سوزم" کو ۲۰۲۱ء میں سنگ میل پبلی کیشن، لاہور نے شائع کیا۔ یہ ناول تاریخی ناول ہے جس میں ایک ہزار سالہ پرانی شاعرہ رابعہ خضداری یا رابعہ بلخی کے نام سے

مشہور ہوئیں۔ مشہور مصنفہ فہمیدہ ریاض نے رابعہ خضداری کے شعری تراجم بشمول "بلوچستان کا ادب" اور "خواتین کے نام" سے وعدہ کتاب گھر، کراچی نے شائع کیے ہیں۔

یہ ناول دراصل ایسی شاعرہ کے بارے میں ہے جو رودکی کے دور کی شاعرہ ہے۔ رودکی کو فارسی شاعری کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس شاعرہ کو زین العرب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کے معنی عربوں کا حسن کے ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں ہے لیکن تذکرہ نگاروں نے اس کی تاریخ پیدائش ۹۴۰ء لکھی ہے اور افغانستان کے مشہور شہر بلخ میں پیدا ہوئیں۔ اس نے اپنے آخری شعر اپنے خون سے محل کی دیوار پر لکھے تھے کیونکہ اس کے بھائی نے غیرت کے نام پر اس کے ہاتھوں کو کاٹا تھا کہ عورتیں شعر و شاعری نہیں کرتیں، نہ ہی حکومت کے معاملات میں مداخلت کرتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں حمیرا اشفاق نے اپنے ناول میں بیان کی ہیں۔ یعنی ایک ہزار سال پہلے مرنے والی شاعرہ کو ناول لکھ کر دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ مزار شریف میں بڑی بڑی عظیم ہستیاں مدفون ہیں جن میں رابعہ خضداری بھی شامل ہیں۔ رابعہ خضداری کا بہت بڑا مجسمہ شہر کے وسط میں نصب ہے۔ رابعہ محبت کی ایک ایسی داستان ہے جو انسانیت سے محبت کرتی ہے لیکن اس کے بھائی کو یہ بات بالکل گوارا نہیں تھی جس کی پاداش میں محل کے اندر ہی اس کا قتل کیا گیا۔ اس کے مزار پر جو لوح ہے اس پر لکھا ہے "آرامگاہ رابعہ خضداری" رابعہ خضداری دختر کعب از فرما رواں بلخ۔

جمیلہ ہاشمی کے ناول "چہرہ بہ چہرہ روبرو" میں نسائی کرداروں کو بڑے ماہرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ قرۃ العین طاہرہ جس نے شاہ ایران کا بستر بننے سے انکار کر دیا تھا۔ شاہ نے اس کی موت کا پروانہ جاری کر دیا لیکن کوئی بھی اس کو مارنے میں آگے نہیں جا رہا تھا۔ کیونکہ وہ خوبصورت عورت ہونے کے علاوہ ایک خوبصورت شاعرہ بھی تھیں۔ لیکن اس کو ایک بدصورت موت دی گئی تھی لیکن شاعر مرد ہو یا عورت وہ مرتا نہیں ہے بلکہ زندہ رہتا ہے۔ مارنے والا ہمیشہ تاریخ میں بُرے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح "می سوزم" میں ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے رابعہ خضداری کو محبت کی علامت قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ آج بھی محبت کرنے والے رابعہ خضداری کے مزار پر محبت کی کامیابی کی منت مانتے ہیں اور اس کا بھائی حارث جس نے رابعہ خضداری اور اپنے باپ کو زہر دلوا کر مروا دیا تھا آج تک بُرے ناموں سے ہی تاریخ کے اوراق میں زندہ ہے۔ رابعہ خضداری کے باپ امیر کعب نے اپنی بیٹی کی تربیت میں ہر قسم کے فن اور اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا تھا۔

جب بیٹی کی شاعری کی دھوم چار سو پھیل گئی تو کعب اپنی بیٹی کی ذہانت سے خوش ہوتا تھا۔ جبکہ اس کا بھائی جو کہ اقتدار کا رسیا اور عوام پر بے جا ٹیکس لگاتا تھا، وہی ان دونوں کا دشمن بنا۔ رابعہ خضداری کے اُستاد مولوی فیض الحسن جو کہ ایک باریش صوفی تھے ان کا یہ کہنا ہے کہ میں امیر صاحب کے بچوں کا اُستاد رہا ہوں لیکن جو صلاحیتیں میں نے رابعہ میں دیکھی ہیں وہ دوسروں کے ہاں کہاں۔ اس دور میں جس کا ذکر ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے اپنے ناول میں کیا ہے کہ جب بھی اپنی مجلس میں شعر وشاعری کا تذکرہ ہوتا تو بڑے بڑے شاعر ان کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ بیٹی کی اس قدر تعریفیں سن کر امیر کعب پھولے نہ سماتا تھا۔ ناول کی ہیت سوانحی طرز کی ہے جس کا ذکر صفِ اوّل پر حمیرا اشفاق نے درج بھی کیا ہے۔ لیکن اس کی تکنیک میں کہیں خط کی تکنیک ہے تو کہیں فلش بیگ یا پیشگوئی کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ کرداروں میں معصوم بے گناہ لوگ جو جنگ کا ایندھن بنتے تھے۔ غدار سپہ سالار جو بادشاہ کو زہر تک دے دیتے ہیں ان کا انجام بھی ناول میں دکھایا گیا ہے۔ ناول میں رابعہ خضداری کا کردار مرکزی نسوانی کردار ہے جو کہ وقت کی نامور شاعرہ ہیں۔

ناول کا ایک کردار فیض الحسن جو کہ رابعہ کا اُستاد بھی ہے۔ ناول میں امام خاتون جو کہ تمام کنیزوں کی سردار ہے جب امیر کعب کی زہر خوردنی سے موت واقع ہوتی ہے شہزادی رابعہ کو فکر لاحق ہوتی ہے کہ جب سے امیر کعب فوت ہوئے ہیں یہ عورت بھی دن بدن لاغر ہوتی جارہی ہے تو اس نے ایک دن بڑے شاہی حکیم کو بلا کر اس کا معائنہ کرنے کو کہا۔ تب شاہی حکیم نے اس کے جوڑوں پر لکڑی کی ہتھوڑی سے ضربیں لگا کر دیکھیں تو دو دن کے بعد اس کے اعضاء نیلے رنگ سے سیاہ رنگ میں تبدیل ہوگئے۔ حکیم نے شہزادی رابعہ کو کہا کہ اس نے بادشاہ کے کھانے کا زہر چکھا تھا۔ سالم خان ناول کا وہ کردار ہے جسے فوج میں جبری بھرتی کر کے لاہور کے محاذ پر بھیجا جاتا ہے۔ وفا خان جو کہ عبدالستار کا بیٹا ہے اس کو بھی ایک فوجی دستے کا سربراہ بنا کر ٹریننگ کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ سالم خان کی ماں جو کہ ایک اندھی خاتون ہے ایک چھوٹا بھائی اور ایک چچازاد بہن ہے جو کہ ایک خاندان ہے۔ ماں بیٹے کی جدائی میں رو رو کر مر جاتی ہے اور اس کا بھائی اپنی تمام بھیڑ بکریاں گاؤں کے مولوی کو دے کر بھائی کی تلاش میں محل کی طرف نکلتا ہے تا کہ اسے ماں کی وفات کا حال سنا سکے۔

ناول "می سوزم" میں بیکتاش کا کردار ایک اچھے سپاہی کا ہے جس کے باپ کو امیر کعب کا خاص غلام ہونے کا شرف حاصل تھا لیکن رابعہ اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ پہلے پہل تو وہ جھجکتی ہے پھر بیکتاش کو پیار بھرا خط لکھتی ہے۔ ملاحظہ ہو پوری سلطنت میں تم وہ واحد شخص ہو جس کا حق ہے کہ میں اس کے لیے

شعر کہوں اور اپنے دیوان کو تیرے نام سے زینت دوں۔ خاتون شاہ بانو ناول میں ایک ادبی کردار ہے۔ ایک دن باغ بہشت میں شام کو محل کے اندر شاعری کی محفل کا انتظام کرتی ہے۔ رات کو چمن اپنی پوری تابانی پر تھا۔ خواتین نے اپنا تازہ کلام سنایا رابعہ جو کہ عروض سے پوری طرح واقف تھی پہلے اس نے لڑکیوں کا کلام غور سے سُنا۔ پھر ان کو ٹوکا کہ یہ کیا ہوا غزل میں بحر کا خیال کیوں نہیں رکھ رہی ہیں۔

ڈاکٹر براؤن جس نے ۱۹۲۴ء میں ہسٹری آف پرشیا لکھی جو کہ تاریخ ادبیات ایران پہلی بار لکھی گئی۔ اس میں بھی قرۃ العین طاہرہ کی بے حد تعریف کی گئی ہے کہ کس طرح ایک نسائی کردار جس نے ظلم کے اندھیروں میں روشنی کی ایک شمع روشن کی۔ آخر شمع کی روشنی ہی بجھ گئی جمیلہ ہاشمی کے ناول کا انتخاب جس میں مرکزی نسائی کرداروں کی وجہ سے آج بھی بابی تحریک زندہ ہے۔

نسائی تحریک جو کہ یورپ میں ۱۷۹۰ء میں شروع ہوئی اس کا باقاعدہ آغاز ۱۸۶۶ء میں انگلستان سے ہوا جس کا نام women suffer age تھا۔ اسی تحریک کی بدولت ۱۹۱۸ء میں خواتین کو ووٹ کا حق ملا ۱۹۲۸ء میں ایک بل کے ذریعے ابتدائی عمر ۲۱ برس رکھی گئی لیکن ۱۹۶۹ء میں نسائی تحریک کی شدت کو دیکھتے ہوئے ۱۸ برس کر دی گئی۔ ہندوستان میں حالات میں بدلا تو اس وقت آیا جب ۱۸۲۹ء میں انگریز نے بزور شمشیر ستی جیسی فضول رسم کو ختم کیا جس میں مرد کے فوت ہونے پر عورت کو بھی جلا دیا جاتا تھا۔ اسی طرح انڈیا ایکٹ ۱۹۲۹ء میں بچپن کی شادی پر پابندی ۱۹۳۹ء میں مسلم عورتوں کو خلع کا حق بھی دیا گیا۔ ہندوستانی عورتوں کے حقوق کے بارے میں سب سے پہلے ڈاکٹر رشید جہاں نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۲ء اپنی وفات تک افسانہ لکھے جن میں عورتوں کے حقوق پر بات کی گئی۔ جمیلہ ہاشمی جس نے اپنے ناول "تلاش بہاراں" میں بھی ایک نسائی کردار کنول کنواری کو پیش کیا۔ جو مادر پدر آزاد ہے نہ تنگ نظر نہ جنون کی حد تک جاتی ہے بلکہ ایک ترقی یافتہ عورت ہے۔ وہ مذہب کو بھی مانتی ہے اور فضول عقائد کو بھی رد کرتی ہے۔ ام سلمٰی کا کردار بھی تنگ نظر سماج کے خلاف بغاوت ہے نہ کہ انسانوں کے خلاف وہ انسانیت سے محبت کرتی ہے۔ قرۃ العین نسائیت کا ایک استعارہ ہے جو علم اور بہادری کی ایک زبردست مثال ہے جس نے اپنا خون دے کر نسائی آزادی کا پروانہ حاصل کیا۔

یہ ناول دراصل ایران کی تاریخی شخصیت اور بابی تحریک کی ایک کارکن فاطمہ زریں تاج لقب قرۃ العین طاہرہ کی کٹھن زندگی پر مشتمل ہے۔ اس میں دراصل ایران کے متوسط طبقے کی طرز زندگی کا خلاصہ

پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کا منشور بھی پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ بادشاہ کی عدالت میں قرۃ العین طاہرہ پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اپنے چچا اور سسر محمد تقی کو اپنے راستے کی دیوار بنتے دیکھا تو اس کو قتل کرا کے خود قزوین سے تہران چلی گئی تھی۔ اس کے کہنے پر ایک بابی نے ۱۸۵۲ء میں نہ صرف دین شاہ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا جس کے بعد غصے میں آکر بابیوں کے قتل عام کا حکم دیا۔

پورے ناول میں کرداروں کی وساطت سے انسانوں، مذہبوں، جنسوں اور ملکوں کی منافرت کو سامنے آتا ہوا دیکھتے ہیں جبکہ قرۃ العین لوگوں کی خاطر انسانوں کی بھلائی کی خاطر انسانوں کے مستقبل کی خاطر اپنی جان قربان کرتی نظر اتی ہے۔

جمیلہ ہاشمی تاریخی ناول نگاروں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں وہ دلکش تشبیہات اور حسین جملوں میں اپنے ناولوں میں انوکھے پن کے بہترین نمونے تخلیق کیے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس نے کئی تکنیکوں کا استعمال کیا ہے وہی ناول "چہرہ بہ چہرہ، روبرو" اور "دشت سوس" میں اظہار کا بیانیہ اختیار کر کے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ اردو ناول کا نسائی کردار شروع سے ہی بڑے اہم ہیں مثال کے طور پر مراۃ العروس، اکبری اور اصغری کا کردار بڑھانے میں اس کے علاوہ اسی ناول میں ماما عظمت کا کردار منفی طرز کا ہے۔ ایک کٹنی کا کردار ہے جو فراڈ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ امراؤ جان ادا میں امرا کا کردار مرکزی کردار ہے۔ مرزار سوانے اس ناول میں جہاں لکھنو کی تہذیب و معاشرت کے علاوہ خانم کا کردار، بسم اللہ کا کردار سبھی بڑے اہم نسائی کردار ہیں، جنہوں نے اردو ناول میں خشت اوّل کا کام کیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی دراصل اپنی پسند کے کردار ڈالتی ہیں "دشت سوس" میں منصور حلاج کا کردار جس کے ارد گرد پورا ناول گھومتا ہے۔ "چہرہ بہ چہرہ، روبرو" تاریخ کا گمشدہ کردار ہے۔ جس میں نسائی کردار کے ذریعے ایک تحریک کو تقویت پہنچی ہے جو ملک میں جاگیرداری اور شہنشائیت کا خاتمہ چاہتی تھی۔ لیکن مقدر کو یہ منظور نہیں تھا۔ یہ نسائی کردار کے ذریعے جس نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر اس تحریک کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔

قرۃ العین طاہرہ کا کردار اس ناول میں مرکزی کردار ہے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قرۃ العین طاہرہ وقت کے مشہور سکالر کاظم رشتی سے خط و خطابت کرتی ہے اور ظاہر و باطن کے فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ طاہرہ کو اپنے عورت ہونے پر بھی غصہ آتا ہے کہ آخر عورت ہونا بھی کیا مصیبت ہے۔ اس میں کیا کمی ہے جو مرد کام کر سکتے ہیں وہ میں نہیں کر سکتی۔ ابتدا میں اس نے اپنے عمر زاد ملا صالح کی بیٹی جو شاعرہ

بھی تھی اس سے بڑی متاثر تھی۔ اس کا چچازاد جو اس کا ہونے والا شوہر تھا۔ اس وقت نجف اشرف میں پڑھتا تھا۔ ہزاروں لڑکیاں اس کے چاہنے والیاں تھیں لیکن اس کو بھی اُم سلمہ کی طرح فلسفہ کا مضمون ہی بڑا پسند تھا۔

طاہرہ اکثر یہ کہتی تھی کہ عربوں کی دوسری قوموں پر فضیلت ان کی اپنی عزت اور قوت مدافعت کی وجہ سے ہے۔ عرب اپنے چہروں کی خوبصورتی اپنی سخاوت، اپنی شجاعت اپنی قوت گفتار پختہ حکمت عملی وفا اور عزت نفس کی وجہ سے باقی قوموں سے ممتاز ہیں اور عربوں سے ہی حضرت علیؓ باب علم تھے اور چوتھے خلیفہ راشد بھی تھے۔ شجاع اور بہادر بھی تھے۔ انہوں نے اسلام کے کئی دشمنوں کو جہنم واصل کیا۔ علیؓ ابن ابی طالب پر جمہوریت کا خاتمہ ہو گیا۔ طاہرہ علم کی ہمیشہ ہی متلاشی رہی وہ ہر وقت تعلیم حاصل کرتی رہی کتب خانوں سے آزادانہ کتابیں لے کر پڑھتی رہی اور ان چیزوں کو بھی موضوع بحث کرتی جس سے لوگ ڈرتے بھی تھے۔

اکثر ایسے شعر کہتی جو مرثیہ نہیں ہوتا تھا۔ ایسے شعر وہ بچپن سے کہتی آرہی تھی۔ ان اشعار میں معصومین کی تعریف بھی نہیں ہوتی تھی۔ پتہ نہیں کہ اس کو عوام سے عشق کیوں تھا ان کے دکھوں کا رونا روتی تھی۔

اکثر وہ یہ سوچتی ہے کہ یہ زندگی لاحاصل ہے۔ کچھ نہ ہونے پر دلالت اس کی مجبوری قسمت پر شاکر رہنے کے لیے ایک تاریخ فلسفہ اور زمانے کی بے سفاکی تھی۔ وہ کم مائیگی انسان کے لیے کوئی بھی امید نہیں ہے اور نہ ہی کوئی راستہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کبھی جمشید بھی ایران کا حکمران تھا۔ وہاں ہی درندے نما انسان اپنی مجلس مشاورت کرتے نظر آتے رہے اور اس جام جم والے بادشاہ جمشید کی ہنسی اڑاتے ہیں اور شاہ بہرام کے مقبرے پر جنگلی گدھے اپنا پاؤں مارتے ہیں، جہاں پر یہ آسودہ خاک ہے اور اس کا سر بالکل نیچے موجود ہے۔

قرۃ العین کے مطابق اس کی سوچ یہ کہتی ہے کہ جہاں کسی زمانے میں صوفی اور عالم بیٹھ کر اپنی مجلس میں مابعد الطبیعات سے متعلق مختلف موشگافیاں کرتے تھے۔ وہ انبیاء اور اولیاء اللہ کی کہی ہوئی باتوں میں سچائیاں ڈھونڈتے اور نقب لگاتے کبھی یہ کہتے کہ اس دنیا میں سب جھوٹ ہے۔ بس ایک بار پھول کھلا اور مرجھا کر خاک میں مل گیا۔ ام سلمہ عام لڑکی نہیں تھی بلکہ چھوٹی عمر میں کافی سمجھدار ہو چکی تھی۔ جب وہ تاریخ کا مطالعہ کرتی تو یہ سوچتی کہ بادشاہوں نے تکلیفیں اٹھا کر ۲۰۰ سال تک مذہب وہ ملت کی جو خدمت کی

ہے۔ اس کے باوجود بھی بادشاہ عام فقیر لوگ جو خانقاہ کے اندر بیٹھے ہیں۔ عوام کو دین و دنیا کی تعلیم دینے سے خائف نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ عوامی شعور ہے جو ان لوگوں کی درسگاہوں سے مل رہا ہے۔ بادشاہ یہ حق دوسروں کو دینا نہیں چاہتے۔ ملا محمد شادی کے بعد اپنی بیوی اُمِ سلمہ کو اکثر ایسی باتیں بتاتا جو اس نے نجف اشرف میں دوران تعلیم اکثر علماء سے سینہ بسینہ سنی تھی کہ یورپ خاص طور پر جو انتہائی شمال میں واقع ممالک ہیں۔ وہ بحیرہ کیسپیئن سے بھی پرے نہ جانے مشرق و مغرب میں کہاں کہاں پہنچ چکے ہیں۔ وہ کمزور طاقت والے ممالک کے ساتھ ایسے ایسے معاہدے کرتے ہیں کہ ان ممالک کو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ جب ان ممالک پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اکثر مسلم ممالک ہی ان کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ سب تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اُمت میں وحدت نہیں ہے اور دن بدن ان کے ممالک یورپی مقبوضات بنتے جارہے ہیں اور مغربی لوگ بڑے چالاک ہیں۔ مقامی بدمعاشوں سے مل کر اس غلامی کو انقلاب کا نام دے رہے ہیں۔

اُم سلمہ کو یہی سوچ بار بار کھائے جاتی تھی کہ آخر بنو فاطمہ پر ہی ظلم کیوں ہوتا رہا۔ اگر عباسی تخت پر بیٹھے تو انہوں نے بنو فاطمہ پر ظلم و ستم کے باب کھولے۔ جب اُموی حکومت آل رسول پر زندگی تنگ کر دی تو بنوعباسؑ نے امام جعفر صادقؑ کے سامنے بھری مجلس میں یہ کہا کہ حضور اُمیہ سے نکلنے کی کوئی راہ بتائی جائے تو انہوں نے کہا کہ بات تو معقول ہے اور دل کو بھی لگتی ہے مگر اس لیے اس پر اتفاق نہیں کرتا کہ حکومت آگے جا کر یعنی ابو جعفر منصور کو ملے گی۔ حضرت کی پیشن گوئی آگے چل کر سچ ثابت ہوئی۔ امام کا وجود تو ہر زمانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ بہائی لوگوں کا مذہب بھی یہی تھا لیکن یہ لوگ جو امام غائب کا تصور دیتے ہیں یہ کہاں تک درست ہے۔ آیا کہ امام کے غائب ہونے سے رشتہ ہدایت کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ یہاں اُم سلمہ کی بار بار سوچ تھی کہ زمانے میں یونانی تراجم نے فلسفے میں انقلاب برپا کر دیا۔ جہاں تک جمیلہ ہاشمی کے تاریخی ناولوں کا تعلق ہے وہاں فکشن کے ساتھ ساتھ تاریخ کا بھی حسین سنگم نظر آتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تاریخ کا ایک اہم واقع ہے۔ اس کے بعد تاج برطانیہ نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا جس کے بعد ملک میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں جس نے ایک نئی فکر کو جنم دیا۔ اسی فکر نے انیسویں صدی میں اصلاحی تحریکوں کو جنم دیا جس میں سرسید تحریک ایک بڑی تحریک ثابت ہوئی۔ اسی تحریک نے نہ صرف سیاسی بیداری اور شعور پیدا کیا بلکہ تعلیمی سطح پر بہت سی مثبت تبدیلیاں پیدا کیں۔ لوگوں کو مغربی نظریات اور فلسفے سے بھی متعارف کروایا۔ سرسید تحریک کی مقصدیت، سلاست و سادگی اور نثری ذریعہ اظہار

نے اُردو زبان و ادب میں ایک نئی کروٹ کو جنم دیا۔ جہاں دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی گئی ناول کی ابتدائی صورت بھی سرسید تحریک کے اہم رکن مولانا نذیر احمد کے ہاں نظر آتی ہے۔ مولانا نے ابتدائی نثری کہانیوں کی شکل میں ناول کی صورت دی۔ اس کے بعد کئی موضوعات پر قلم اُٹھایا اور بہت سے نظریات اور افکار کو کہانی کی شکل دی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اس تحریک نے شدت اختیار کی اور بعض مقامات پر عملی کامیابی بھی حاصل کی۔ یورپ میں اس تحریک کے آغاز کی وجوہات جاننے کے لئے، فرانس و انقلاب فرانس کے بعد کے حالات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ چارلس موریس نے ۱۷۹۱ء میں فرانس کی قومی اسمبلی میں تعلیم نسواں کے حوالے سے آواز اٹھائی۔ اس منشور کے مطابق مردوں کو عام تعلیم دینے کے حوالے سے بات کی گئی جب کہ خواتین کو بنیادی گھریلو تعلیم دینے تک محدود رکھا گیا۔ اس جواز کی یہ دلیل دی گئی کہ مرد کو تو دنیا سنبھالنی ہے، لہٰذا مرد کو اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے اور چونکہ عورت اُمور خانہ کی ذمہ دار ہے لہٰذا اس کے لیے گھریلو اور بنیادی تعلیم کافی ہے۔

ان دونوں ناولوں کو دیکھا جائے تو بطور نمونہ ناول کا اکتساب پیش کیا گیا ہے۔ ان میں تاریخ اور فکشن دونوں یکجا ہیں لیکن پر فریب سچ کے کتنی قریب تحریر ہے اور یہ ایک مردانہ سوچ کی بجائے نسائی سوچ ہے جو تاریخ کے ورق کو اپنی مرضی سے تبدیل کر رہی ہے۔ یہاں ایک کامیاب فنکشن نگار کا کمال ہوتا ہے۔ ان ناولوں میں عورت گھٹن زدہ معاشرے کی بھینٹ چڑھتی نظر آتی ہے۔ نسائی تحریکیں اسی معاشرے کے خلاف پروان چڑھتی نظر آتی ہیں۔ عورت کے ساتھ انسان کے طور پر اچھا سلوک کرنا ہی مہذب معاشرے کی نشانی ہوتی ہے۔ دونوں ناولوں کے مرکزی نسوانی کردار فرسودہ رسم و رواج کے خلاف ہیں ایسے نظام کو بدلنے کی کوشش بھی کرتی ہیں مگر ناکام ٹھہرتی ہیں اور دونوں ہی کردار بالآخر موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں۔

نتائج

مقالے میں بیان کیے گئے دونوں ناول تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ دونوں ناولوں میں پرانی روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ دونوں ناول چونکہ خواتین نے ہی تحریر کیے ہیں، اس لیے وہ خواتین کی نفسیات اور ان کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کے بارے میں خصوصی مطالعہ اور علم رکھتی ہیں۔ جمیلہ ہاشمی اور حمیرا اشفاق نے مردوں کے معاشرے میں خواتین کے ساتھ ہونے والے استحصال کے بارے میں کھل کر وہ تمام باتیں بیان کی ہیں جن کے باعث معاشرے میں مرد کو عورت سے بڑا اور عورت کو مرد سے چھوٹا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ تاریخ میں کئی ایسے کام جو مرد انجام نہیں دے سکتے۔ وہ کام عورتوں نے بخوبی انجام دیے ہیں لیکن پھر بھی معاشرہ عورت کی خدمات کا اعتراف کرنے سے گریز کرتا ہے اور مرد کی معمولی خدمات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔

اسلام نے عورت اور مرد دونوں کو مساوی حقوق دیے ہیں۔ حمیرا اشفاق کے ناول "می سوزم" میں بھی ایک ایسی ہی شاعرہ رابعہ خضداری کی کہانی پیش کی گئی ہے جو مردوں سے بھی اچھی شاعرہ اور منتظم ہے لیکن اس کا بھائی اس کی ان تمام صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کرتا اور اُمور مملکت کے سارے کاموں کا سہرا اپنے سر رکھنے کی کوشش کرتا ہے جب کہ اس کا باپ اپنی بیٹی کی صلاحیتوں پر فخر کرتا ہے۔

اسی طرح جمیلہ ہاشمی کے ناول "چہرہ بہ چہرہ، روبرو" میں بھی قرۃ العین طاہرہ کی بہادری کا ذکر کیا گیا ہے کہ جو بابی تحریک کی بانی ہے اور اس نے عورت کی پستی، سماج میں پھیلی ہوئی جہالت، توہمات پرستی اور غلط رسم ورواج کی بھینٹ چڑھی عورت کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے سماجی برائیوں کی نشاندہی کی ہے۔

ایک عورت ہونے کے ناطے سے رابعہ خضداری میں چند ایک ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں کہ جن کے اس کی شخصیت پر بحیثیت عورت فخر کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی تمام تر خوبیوں میں ناول کا ایک یکتا کردار ہے۔ اگر اس کی پہچاں شاعرہ کی حیثیت سے ہے وہ ایک منفرد شاعرہ، اپنے باپ کے اُمور سلطنت چلانے میں ماہرِ اگر بیکتاش سے محبت کرتی ہے تو اس پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے۔ اس کے ساتھ وہ اپنے باپ کی بھی دل وجان سے فرماں بردار ہے۔ اپنے والد سے بھی ٹوٹ کر محبت کرتے ہے۔

اس لیے یہ بھی سچ ہے کہ بیٹیوں کی اپنے والدین سے محبت بیٹوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔یہی اس ناول کا حسن ہے۔

ناول "چہرہ بہ چہرہ روبرو" میں تانیثی تنقید کی روشنی میں یہ بات اہم ہے کہ جمیلہ ہاشمی نے عورت کے استحصال، معاشرتی دباؤ، اور آزادی کی خواہش کو بہت خوبی سے اُجاگر کیا ہے۔ ان کی تحریر میں عورت کی آواز، اس کا شعور اور اس کے حق میں کھڑے ہونے کی تڑپ نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں عورت کی جدوجہد اور آزادی کے حوالے سے ایک تانیثی نقطہ نظر واضح ہوتا ہے۔

ناول "می سوزم" اور "چہرہ بہ چہرہ روبرو" ایک گہرا اور پیچیدہ تصور ہے جس میں مختلف تجزیاتی عناصر شامل ہو گئے ہیں۔ اس جملے میں "می سوزم" ایک داخلی احساس یا جذبہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے، جو کہ انسان کے دل یا دماغ کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ "چہرہ بہ چہرہ روبرو" ایک بیرونی منظر یا تعلق کو ظاہر کرتا ہے جہاں دو افراد ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں۔

مذکورہ دونوں ناولوں کا مقصد معاشرے میں پیدا ہونے تفاوت اور ناانصافیوں کو دور کرنے کے لیے معاشرے کی توجہ حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

سفارشات

☆ خواتین کے تاریخ میں کیے گئے بڑے کاموں کا جائزہ لے کر اسے معاشرے میں اُجاگر کیا جائے۔

☆ دونوں ناولوں "می سوزم" اور "چہرہ بہ چہرہ روبرو" میں بیان کیے گئے خواتین کرداروں کو اُجاگر کیا جائے۔

☆ تعلیمی ترقی کے لیے تعلیمی میدان میں خواتین کو زیادہ سے زیادہ سہولیات دی جائیں کیونکہ خواتین کی تعلیم پورے معاشرے کی تعلیم ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:(WORKING BIBLIOGRAPHY)

جمیلہ ہاشمی، چہرہ بہ چہرہ روبہ رو، رائٹرز بک کلب لاہور، ۱۹۹۷ء

حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، می سوزم، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۱ء

ثانوی ماخذ:(SECONDARY SOURCES)

اِبن حنیف، دُنیا کا قدیم ترین ادب، جلد دوم، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۹۸ء

ابوالکلام آزاد، مولانا، مقدمہ مشمولہ مسلمان عورت، لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۰۶ء

ارجمند آرا، تانیثی مطالعات، روشان پرنٹرز، دہلی، ۲۰۱۶ء

ارشاد احمد پنجابی، پنجاب کی عورت۔ حیات و ثقافت، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب ۱۹۷۶ء

آزادی نسواں کا فریب "فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ، دہلی ۱۹۹۹ء

امیر حمزہ، بہائیوں اور بابیوں کے مہدی، نئے نبی اور ادب اعلی، الدعوۃ جلد ۴، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۱۹۹۵ء

انیس ہارون، فیمنزم اور پاکستانی عورت، فیمنزم اور ہم (ادب گواہی)، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء

انیس ہارون، فیمنزم اور پاکستانی عورت، فیمنزم اور ہم (ادب گواہی)، وعدہ کتاب گھر، کراچی ۲۰۱۳ء

ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی اہل قلم خواتین: ایک ادبی جائزہ، اسلام آباد اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۳ء

بانو قدسیہ "دوسرا دروازہ" سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر "جمیلہ ہاشمی کے دوناول" معاصر ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

جمیل، ڈاکٹر، نسائی شعور کی تاریخ اردو افسانہ اور عورت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء

جمیلہ ہاشمی، تلاش بہاراں، دوسرا ایڈیشن، لاہور ۱۹۶۲ء

حمیرا اشفاق (مرتبہ) "نثر رشید جہاں" سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء

حمیر ہاشمی، عورت اور نفسیات مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک

رابعہ الرّبا، عورت۔ مصائب، وجوہات، نفسیات، لاہور دعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

روبینہ سہگل،ڈاکٹر فیمینزم اور پاکستان میں تحریکِ نسواں،(ترجمہ،سوڈب عسکری)
زاہد محمود،ڈاکٹر،گھریلو تشدد۔ وجوہات،اثرات اور انسداد،لاہور: نگارشات،۲۰۰۶ء
سعد اللہ جان برق،حوّا کی بیٹیاں۔یونداااور اقلیمیا مشمولہ دخترِ کائنات،لاہور سانجھ پبلی کیشنز ۲۰۰۸ء
سلیم اختر ڈاکٹر،عورت جنس اور جذبات،لاہور مکتبہ جمال ۲۰۰۶ء
سمیون دی بوائر،ترجمہ یاسر جواد،جسمانی تاریخ،نفسیاتی اور معاشرتی مطالعہ عورت، فنکشن ہاؤس،۱۹۹۹ء
سہیل احمد خان ، محمد سلیم الرحمن (مؤلفین):"منتخب ادبی اصطلاحات"، لاہور ، شعبہ اُردو جی سی یو ، ۲۰۰۵ء
سید محمد عقیل،جدید ناول کا فن،نیا سفر پبلیکیشنز الہ آباد (بھارت)،۱۹۷۷ء
سید محمد عقیل،تانیثیت۔ایک تھیوری،آدھی عورت۔پورا ادب فکشن ہاؤس لاہور،۲۰۱۷ء
سیما صغیر،ڈاکٹر،تانیثیت اور اردو ادب (روایت،مسائل اور امکانات)،براون پبلی کیشنز، نئی دہلی،۲۰۱۸ء
شبنم آرا، تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی، ۲۰۰۸ء
شرافت حسین شفقے،سید،عورت مذہب اور حکومت،نسیم بک ڈپو،لاہور،س ن
شمس الرحمان فاروقی:"تانیثیت کی تفہیم"،مشمولہ ادبیات،اسلام آباد،۲۰۰۶ء شمارہ ۵۹
شمیم مختار،کیا عورت آدھی ہے؟لاہور شاہد پبلی کیشنز س ن
صالحہ صدیقی،اردو ادب میں تانیثیت کی مختلف جہتیں،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،دہلی،۲۰۱۳ء
صبیحہ حفیظ،ڈاکٹر،لوریاں،لوک رسوم،اور سماجی تفریق مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبان حال تک
صدف حسن،ادب نسواں اور معاشرتی تصور،کراچی یونیورسٹی،کراچی ۲۰۰۷ء
ضمیر علی بدیوانی / فاطمہ حسن،نسائیت کی تحریک اور اردو ادب،مکالمہ (کتابی سلسلہ ۱۰)،کراچی:اکادمی بازیافت،جنوری تاجون،۲۰۰۳ء
ضیاالدین،پروفیسر،ڈاکٹر،حافظ،سید، قبل از اسلام اور بعد از اسلام،
عابد علی،پروفیسر،ڈاکٹر،عورت قرآن وسنت اور تاریخ کے آئینے میں،لاہور: قرآن منزل،س ن،

عادل مشتاق،ڈاکٹر،پاکستانی اردو ناول اور طبقاتی کشمکش، فروغ زبان پبلیکیشنز، ساہیوال،۲۰۲۱

عبدالرحمن خان، ایم، عورت انسانیت کے آئینے میں، لاہور شیخ اکیڈیمی، ۱۹۷۴ء،

عبدالکریم ذاکر نائیک، ڈاکٹر، کیا حجاب عورت کا استحصال نہیں، س۔ن،

عبدالکریم ذاکر نائیک، ڈاکٹر، اسلام میں خواتین کے حقوق۔ جدید یا فرسودہ، لاہور: دارلنوارد، ۲۰۰۶ء،

عبدالکریم ذاکر نائیک ،ڈاکٹر ، اسلام میں خواتین کے حقوق ۔ جدید یا فرسودہ،لاہور: دارلنوارد،۲۰۰۶ ۲۰۰۶ء

عصمت جمیل، ڈاکٹر، نسائی شعور کی تاریخ اردو افسانہ اور عورت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۱۲ء

عظمیٰ فرمان، نسائی تنقید مسائل و مباحث، مشمولہ تحقیق، شمارہ ۱۸، ۲۰۰۹ء

عظمیٰ فرمان فاروقی، ڈاکٹر، اردو ادب میں نسائی تنقید (روایت، مسائل، مباحث) سعید پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۰ء

عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں تانیثیت، شعبہ اردو بہاوالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، جولائی ۲۰۱۵ء

فاطمہ حسن، ڈاکٹر، مدون، فیمنزم اور ہم، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء

فردوس احمد بٹ ،ڈاکٹر،اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ جلد اوّل،سہ ماہی ادبیات،اکادمی ادبیات، پاکستان، ۲۰۱۹ء

فرزانہ اسلم: 'عصمت چغتائی، بحیثیت ناول نگار'، پٹنہ، ۱۹۹۴ء، س۹۵

فیمنزم اور ہم ، ڈاکٹر، فاطمہ حسن وعدہ کتاب گھر، ۲۰۱۳ء فہمیدہ ریاض، فیمنزم اور ہم، مشمولہ فیمنزم اور ہم (ادب کی گواہی) فاطمہ حسن، ادارت، ڈاکٹر، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء

قمر رئیس: آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ،

کشور ناہید، ڈاکٹر نوال السوداوی، غلاموں کی آزادی مترجمہ شفقت تنویر مرزا مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبان حال تک،

کشور ناہید، بُری عورت کے خطوط، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

کشور ناہید، عورت کے خلاف جنگ، مترجمہ شفقت تنویر مرزا۔ مسعود اشعر مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک

کشور ناہید، عورت زبان خلق سے زبان حال تک، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء

کشور ناہید، عورت، خواب اور خاک کے درمیان، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

کشور ناہید، عورت زبان سے زبان حال تک، سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۰ء

کلیم احسان بٹ: ''تفہیم و تحسین''، گجرات روزن پبلشر، ۲۰۰۸ء

مبارک علی ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، لاہور فکشن ہاوس، ۲۰۰۵ء

مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت (چوتھا ایڈیشن)، ارتقا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز، کراچی، فروری ۲۰۱۰ء

محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور (طبع دوم)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

میریلین فرنچ: ''عورت کے خلاف جنگ پر محاذ''، مترجم مسعود اشعر، مرتبہ کشور ناہید، مشمولہ ''عورت زبان خلق سے زبان حال تک''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۰ء

نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

نذیر احمد: 'جیلانی بانو کی افسانہ نگاری'، مشمولہ، 'الفاظ'، شمارہ جون ۱۹۸۴ء، مدیر جمیل اختر،

وزیر آغا، ڈاکٹر، تانیثیت مشمولہ تضمین (سہ ماہی)، لاہور: حافظ جمیل پرنٹنگ پریس، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۷ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، تانیثیت مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن، لاہور: مارچ۔ اپریل، ۲۰۰۷ء

یاسر جواد، (مترجم) سیمون دی بوا، عورت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۹ء

لغات:

اردو لغت (تاریخی اصول پر)، ترقی اردو بورڈ کراچی، جلد چہارم، ص ۹۰۸

احمد دہلوی، سید، مولوی، فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۲ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اُردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء

رفیق خاور، اُردو تھیسارس، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، دسمبر ۱۹۹۳ء، ص ۴۰۶-۴۰۷
رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، اوکسفرڈ اُردو انگریزی لغت، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۳ء
وارث سرہندی، علمی اُردو لغت، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۹۶ء

ENGLISH BOOKS

Elaine Showalter: 'Toward a Feminist Poetics. In The New Feminist Criticism. New York : Pantheon, 1985

Herbert Lockyer , all the women of the bible (4th addition) india, Zondervan publishing house , 2005, p:18

Kishwer Naheed , women myth & realities. Lahore ,sang-e-meel publications 2008, page:190

Kishwer Naheed , women myth & realities. Lahore ,sang-e-meel publications 2008, page:16

ENCYCOLPEDIA:

Britannica Concise Encyelopedia http://www .britannica. com/feminism Retrieved on 27/11/2008

The New Encyclopedia Bertinca valume 19,15th edition, page:160

ضمیمہ جات

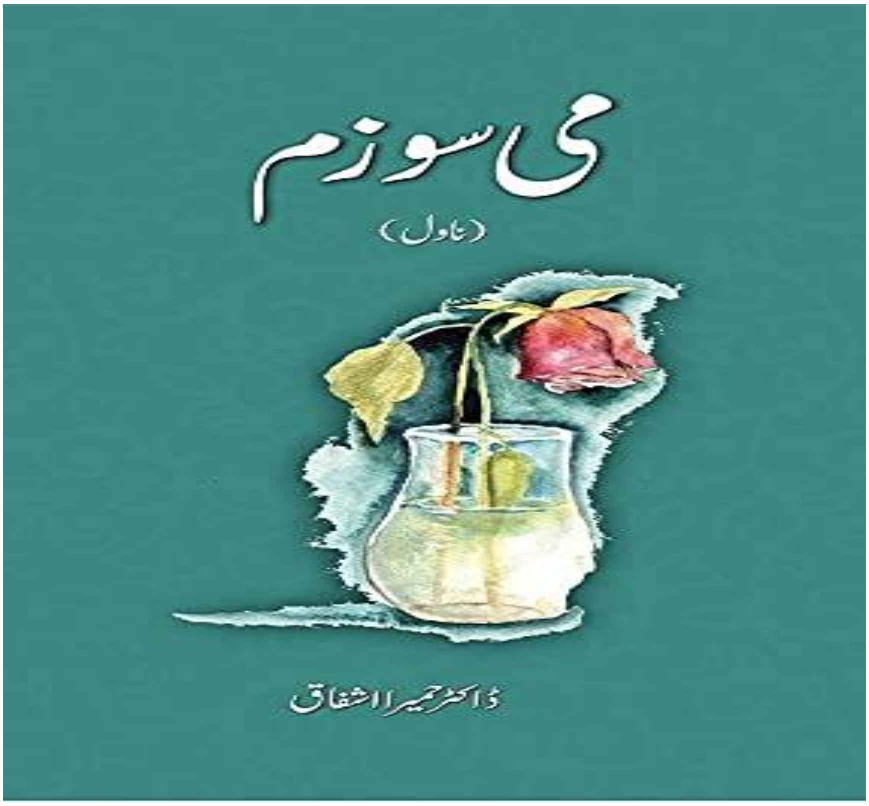
می سوزم
(ناول)
ڈاکٹر حمیرا اشفاق

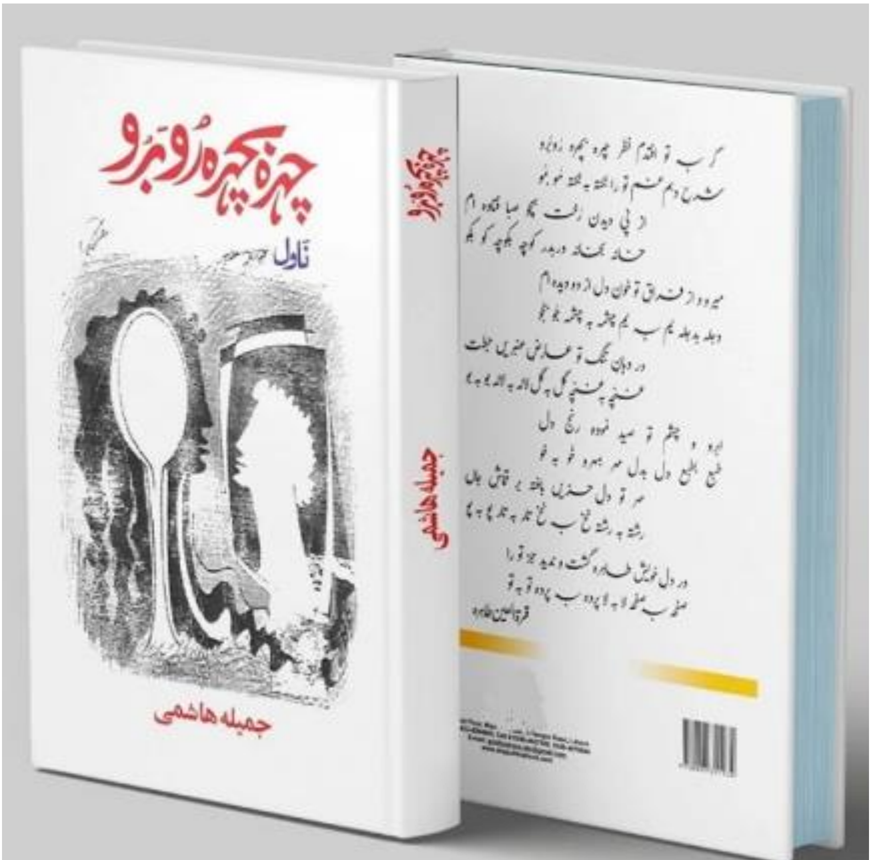
چہرہ بچہرہ روبرو
ناول
جمیلہ ہاشمی